اشاعت کا ۹۵واں سال

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

سال نو کی مبارکباد

یوم جمہوریہ مبارک

جنوری ۲۰۱۸ء

۱۰ روپے

شارب ردولوی

شکیل صدیقی

گیتا شری

رخشندہ روحی مہدی

ایم ایم محسن

ندیم راعی

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

اردو کے مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش (جنوری)

حسرت موہانی

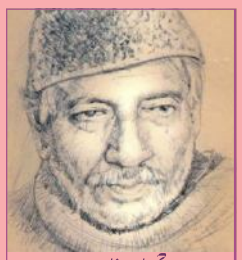
جمیل مظہری

منشی نول کشور

زاہدہ زیدی

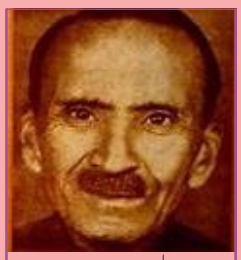
بسمل سعیدی

عرفان صدیقی

پیغام آفاقی

شاہد کلیم

عبدالحلیم شرر

کیفی اعظمی

ہاجرہ مسرور

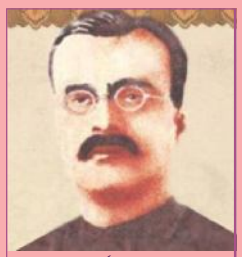
برج نرائن چکبست

قرۃ العین حیدر

صفیہ اختر

شاذ تمکنت

حسرت موہانی	یکم جنوری ۱۸۷۵	۱۳ رمئی ۱۹۵۱
جمیل مظہری	یکم جنوری ۱۹۰۴	۲۳ رجولائی ۱۹۷۹
ثاقب لکھنوی	۲ رجنوری ۱۸۶۹	۲۴ رنومبر ۱۹۴۶
نول کشور	۳ رجنوری ۱۸۳۶	۱۹ رفروری ۱۸۹۵
زاہدہ زیدی	۴ رجنوری ۱۹۳۰	۱۲ رجنوری ۲۰۱۱
بسمل سعیدی	۶ رجنوری ۱۹۰۲	۲۶ راگست ۱۹۷۷
حسن نعیم	۶ رجنوری ۱۹۲۷	۲۲ رفروری ۱۹۹۱
ظفر پیامی	۶ رجنوری ۱۹۳۲	۱۰ ردسمبر ۱۹۸۹
شمیم رضوی	۶ رجنوری ۱۹۶۶	۱۹ راگست ۲۰۰۹
شاد عظیم آبادی	۷ رجنوری ۱۸۴۶	۶ رجنوری ۱۹۲۷
سید حامد	۷ رجنوری ۱۹۲۰	۲۹ ردسمبر ۲۰۱۴

عرفان صدیقی	۸ رجنوری ۱۹۳۹	۱۶ راپریل ۲۰۰۴
پیغام آفاقی	۱۰ رجنوری ۱۹۵۶	۲۰ راگست ۲۰۱۶
بلراج ورما	۱۰ رجنوری ۱۹۲۳	۱۰ رجنوری ۲۰۱۲
رشید حسن خاں	۱۰ رجنوری ۱۹۳۰	۲۵ رفروری ۲۰۰۶
احمد فراز	۱۲ رجنوری ۱۹۳۱	۲۵ راگست ۲۰۰۸
شاہد کلیم	۱۲ رجنوری ۱۹۵۱	۱۳ راپریل ۲۰۰۶
جگت موہن لال رواں	۱۴ رجنوری ۱۸۸۹	۲۶ رستمبر ۱۹۳۴
عبدالحلیم شرر	۱۴ رجنوری ۱۸۶۰	۲۴ ردسمبر ۱۹۲۶
حفیظ جالندھری	۱۴ رجنوری ۱۹۰۰	۱۲ رنومبر ۱۹۸۲
کیفی اعظمی	۱۴ رجنوری ۱۹۲۴	۱۰ رمئی ۲۰۰۲
امیر آغا قزلباش	۱۵ رجنوری ۱۹۴۳	۲۵ رمئی ۲۰۰۳

ہاجرہ مسرور	۱۷ رجنوری ۱۹۲۹	۱۵ رستمبر ۲۰۱۲
برج نرائن چکبست	۱۹ رجنوری ۱۸۸۲	۱۲ رفروری ۱۹۲۶
قرۃ العین حیدر	۲۰ رجنوری ۱۹۲۷	۲۱ راگست ۲۰۰۷
جمیل الدین عالی	۲۰ رجنوری ۱۹۲۵	۲۴ رنومبر ۲۰۱۵
سکندر علی وجد	۲۲ رجنوری ۱۹۱۳	۱۶ رمئی ۱۹۸۳
صفیہ اختر	۲۵ رجنوری ۱۹۱۸	۱۷ رجنوری ۱۹۵۳
فرمان فتح پوری	۲۶ رجنوری ۱۹۲۶	۳ راگست ۲۰۱۳
اقبال سہیل	۲۸ رجنوری ۱۸۸۵	۷ رنومبر ۱۹۵۵
عشرت کرتپوری	۲۸ رجنوری ۱۹۲۴	۲۰ رستمبر ۲۰۰۰
شاذ تمکنت	۳۱ رجنوری ۱۹۳۳	۱۸ راگست ۱۹۸۵
نامی انصاری	۳۱ رجنوری ۱۹۳۰	۹ رجنوری ۲۰۱۰

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۲ شمارہ : ۱۰

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

جنوری ۲۰۱۸ء

پبلشر: انج کمار جھا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹر

سہیل وحید

فون: 9415007694

Ph. No. 2239132 Ext. 228

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ۱۱۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر/رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

اداریہ

اپنی بات ..... ایڈیٹر ۲

یوم جمہوریہ

یوم جمہوریہ؛ جمہوری قدروں کے احتساب کا دن ..... ایم ایم محسن ۳

یوم جمہور ..... ڈاکٹر ذکی طارق ۶

وطن کے نام ..... دیدار اکبر پوری ۸

گوشۂ عابد سہیل

جو یاد رہا ..... عابد سہیل ۹

عابد سہیل کی خاکہ نگاری ..... پروفیسر شارب ردولوی ۱۶

عابد سہیل؛ کھلی کتاب بند کتاب ..... شکیل صدیقی ۲۰

عابد سہیل کی ادبی صحافت پر ایک نظر ..... موسیٰ رضا ۲۱

گزشتہ لکھنؤ

.....انگریزوں پر چڑھائی کرنا ..... محمد نجم الغنی خاں ۴۱

افسانے

لمحہ ایک گمان کا ..... رخشندہ روحی مہدی ۳۶

یہ تو میں نے سوچا نہ تھا ..... ندیم راعی ۳۹

ہندی کہانی

بالجبر ..... گیتا شری ۴۵

ہندوستانی زبانیں

ایندھن (آٹھویں قسط) ..... حمید دلوائی ۵۳

بازدید

برج نارائن چکبست ۳۲

گل افشانیاں

انگریزی کا بھوت ..... ریاض توحیدی ۵۸

غزلیں اور نظمیں

احسن رضوی ..... ۲۴ مسرور صفری ۲۵

ڈاکٹر حنیف ترین ..... ۲۶ الکا استھانا ۲۶

رئیس انصاری ..... ۲۷ احمد نثار ۲۷

ظفر صہبائی ..... ۲۸ عرفان لکھنوی ۲۸

رام پرکاش بیخود ..... ۲۹ رخشاں ہاشمی ۲۹

نیاز سلطانپوری ..... ۳۰ فردوس گیاوی ۳۰

منیش شکلا ..... ۳۱ ابھیشیک شکلا ۳۱

رئیسہ نہار آرزو ..... ۳۴ ہاجرہ نور زریاب ۳۴

ریحانہ عاطف خیر آبادی ..... ۳۵ خادم رسول عینی ۳۵

تبصرہ

ہندوستانی شاعرات ..... ڈاکٹر نجمہ رحمانی ..... ڈاکٹر مظہر احمد ۶۰

آنکھوں کے اس پار ..... فوزیہ رباب ..... ڈاکٹر عادل حیات ۶۱

تاثرات

آپ کے خطوط ۶۴

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

اردو ادب ہماری مختلف تہذیب وثقافت اور جملہ فنون لطیفہ کے حسین امتزاج کا ایک خوبصورت سنگم ہے۔ جس کا کینوئیس بہت وسیع ہے، اس میں ہر طرح کے سماجی، معاشرتی اور انسانی نفسیات اور اس کے باطنی وخارجی مسائل کے مختلف رنگ موجود ہیں، جسے پڑھنے کے بعد انسان اپنی اقتادِ طبع کے مطابق اس میں سے انبساط والمیات کا رنگ کشید کرتا ہے۔ غالبا دنیا کے تمام ادب کا یہی وطیرہ ہے۔ جہاں تک زبان وادب کا تعلق ہے، تو اس میں فطری طور سے اپنے اندر ایک سیلانی کیفیت پائی جاتی ہے، اور اس میں وقت کے تقاضے کے

محمد بیگ 'بیگ احساس' کو ان کے افسانوں کے مجموعہ 'دخمہ' کے لئے سال ۲۰۱۷ء کے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ بیگ احساس نے عرصۂ دراز تک عثمانیہ یونیورسٹی اور حیدرآباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اپنی خدمات انجام دیں۔ وہ حیدرآباد سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'سب رس' کے مدیر ہیں اور تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ انہیں اس سے قبل کئی انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔ ادارۂ 'نیا دور' کی جانب سے انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کی مبارکباد۔

مطابق بدلاؤ کا تدریجی سلسلہ جاری وساری رہتا ہے۔ ہمارے اردو ادب میں آج بھی انسان کی آزادی، جمہوری قدروں کی آبیاری اور ہمارے ملک میں رونما ہونے والے انقلاب کی آواز کو بہت واضح طور سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا ملک جب غلامی کی زنجیروں سے آزادی کی جدوجہد کر رہا تھا، اسوقت آزادی کی زمین کو ہموار کرنے اور اسے تحریک دینے والے کوئی اور نہیں بلکہ ہمارے ادبا وشعرا تھے، جنھوں نے اپنی تحریروں سے ہندوستان کے عوام میں جوش وولولہ پیدا کیا اور ان کے دل سے خوف وہراس کو دور کرنے کا اہم کام کیا، جس کے بغیر آزادی کا تصور نہ ممکن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے بہت سے ادبا وشعرا اور صحافیوں کو بڑی صعوبتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، جس کی زندہ مثال مولوی محمد باقر ہیں، جنھیں انگریز حکومت کے خلاف اپنی بغاوت آمیز تحریروں کے جرم میں توپ کے دہانے پر باندھ کر اڑا دیا گیا، لیکن اس کے باوجود ہمارے اردو ادب کے انقلاب پسند قلمکاروں کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ حسرت موہانی جیسا

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

جلد ہی نیا دور کے اس سال کے تمام شمارے فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ کے لئے پوسٹ کئے جائیں گے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ادب کا بانکا سپاہی جس نے انگریز حکومت کے خلاف اپنے قلم کے ذریعہ محاذ کھول دیا، بغیر کسی انجام کے پروا کئے بغیر، جس کے لئے انھیں کالا پانی کی جیسی سزا دی گئی۔ مجاہد آزادی اشفاق اللہ خاں کی شاعری نے بھی ہندوستانیوں کے دلوں میں جوش بھرنے کا کام کیا۔ ۱۸۵۷ کے انقلاب میں ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں نے جو انگریز حکومت کے خلاف ماحول پیدا کیا تھا اسے اردو شاعری نے انگریز دشمنی میں بدل دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اردو ادب میں بہت سی تحریکیوں نے جنم لیا یہاں تک کہ اردو شاعری میں میر تقی میر اور غالب جیسے عظیم شاعر نے بھی غلام ہندوستان کی بدحالی کا نقشہ اپنی اردو شاعری کے ذریعہ بڑے ولولہ انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ آزادی سے متعلق اردو شاعروں نے جو ذہنی بیداری پیدا کی تھی آزادی کے ان متوالوں کو بندوق کی گولیوں، طوق وسلاسل اور پھانسی کے پھندوں سے بھی روکا نہ جا سکا۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے وقت ہندوستان کے عوام کو ایک دھاگے میں پرونے رکھا وہ بلاشبہ اردو زبان ہی تھی۔ ہماری اردو شاعری اور مصنفین نے اس تحریک کو انقلاب کی شکل وصورت دینے میں اپنا بھرپور تعاون دیا ہے۔ اسی طرح سے سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، کرشن

نیا دور ریختہ پر

'نیا دور' کے گزشتہ برس کے شمارے rekhta.org پر اپلوڈ کر دئے گئے ہیں۔ عالمی سطح پر اردو کے مختلف حلقوں تک 'نیا دور' کی رسائی میں اب کوئی دشواری نہیں رہ گئی ہے۔

چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور خواجہ احمد عباس نے اپنی انقلابی تحریری کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی کے پرچم کو بلند اور انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ انگریزوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ منٹو کی کی کہانیاں، تماشہ، نیا قانون، وغیرہ میں انگریزوں کے ذریعہ ہندوستانی عوام پر کئے جانے والے تشدد کو بیان کیا گیا ہے، جس نے لوگوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ بات بھی اپنے اندر معقول جواز رکھتی ہے کہ ہمارے نثری ادب کے مقابلے میں اردو شاعری نے آزادی کی تحریک کو مزید عزم واستقلال وجوش وجنون سے لبریز کر دیا، کیونکہ شاعری براہ راست دل کے مضراب پر رقص کرتی ہے اور جذبات کو برانگیختہ کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے حوالے سے نظیر اکبرآبادی، علی سردار جعفری، جوش ملیح آبادی، مخدوم محی الدین، وامق جونپوری، مجاز، کیفی اعظمی اور فراق گورکھپوری نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ آزادی کی جدوجہد اور اس کی آبیاری کے لئے ایک اہم کارنامہ انجام دیا۔ مجھے فراق گورکھپوری کا اردو سے متعلق یہ جملہ ہمیشہ یاد آتا ہے، کہ فراق صاحب اپنے شاگردوں سے اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ ''تم اردو

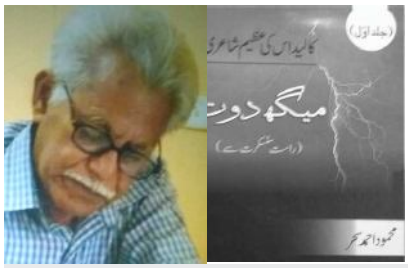

اجین کے نامور ادیب، شاعر اور ناول نگار محمود احمد سحر نے کالیداس کی تین تخلیقات میگھ دوت، رتو سنہار اور کمار سنبھو کو اردو ترجمہ کے قالب میں ڈھالا۔ 'کمار سنبھو' کے اردو ترجمہ کے لئے انہیں سال ۲۰۱۷ء کے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ادارۂ 'نیا دور' کی جانب سے انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کی مبارکباد۔

اس لئے پڑھو کہ افسر بننے کے بعد افسر دکھائی دو۔''

نیا دور کے سرورق کے اندرونی حصہ پر مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ ولادت ووفات سے متعلق شائع ہونے والا جدول قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کلینڈر سے اقتباس ہے لہٰذا تاریخی اغلاط کے لئے 'نیا دور' کسی طرح کا ذمہ دار نہیں ہے۔

قارئین 'نیا دور' کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا دسمبر ۲۰۱۷ء www.information.up.nic.in پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

یوم جمہوریہ

جمہوری قدروں کے احتساب کا دن

ایم ایم محسن

3/16، تلک رائے، سکریٹریٹ کالونی، لکھنؤ

موبائل: 9415410786

اگرچہ، 15 اگست 1947 کو ہمارا یہ وطن ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا، اور طوقِ سلاسل کا سلسلہ ختم ہوا۔ تقریباً دوسو سال تک مسلسل قربانیوں اور جانفشانیوں کے بعد آزادی کا یہ دن دیکھنے کو نصیب ہوا، جانوں کا نذرانہ پیش کرنے اور سب کچھ لٹانے کے بعد ہمارا ہندوستان آزاد ہو گیا تھا لیکن 26 جنوری 1950 کو ہندوستانی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس دن ہندوستان کے آئین کا نفاذ کیا گیا اور ہندوستان ایک خودمختار ملک اور ایک مکمل طور پر ریپبلکن یونٹ بن گیا، جس کا خواب ہمارے رہنماؤں نے دیکھا تھا، اپنے خونِ جگر سے گلستاں کی آبیاری کی تھی اور اپنے ملک کی خودمختاری کی حفاظت کے لیے جام شہادت بھی نوش کیا تھا۔ چنانچہ آئینی نفاذ کے دن کے طور پر 26 جنوری کو بطور یادگار منانے کے لیے طے کیا گیا۔ یہ دن، آزاد اور جمہوریۂ ہند کی حقیقی روح کی نمائندگی کرتا ہے، لہٰذا اس دن ہمارا ملک ''ایک جمہوریہ'' ہونے کے ناطے اسے جشن کے طور پر مناتا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان، دنیا کی سب سے بڑی پارلیمانی، غیر مذہبی جمہوریت ہے۔ اس کے دستور کی کچھ اہم خصوصیات ہیں۔ آئین ہند نے یہاں کے شہریوں کو خود اپنی حکومت منتخب کرنے کے لیے خودمختار بنایا ہے اور ہندوستانی عوام کو سرچشمۂ اقتدار و اختیار مانا ہے یوم جمہوریہ یعنی 26 جنوری ہندوستان کا ایک تاریخی دن ہے۔ اس دن کو پورے ملک میں بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ مختلف صوبے کی جھانکیوں سے اس کی رونق کو دوبالا کیا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد 1950 میں ہندوستان کا جمہوری

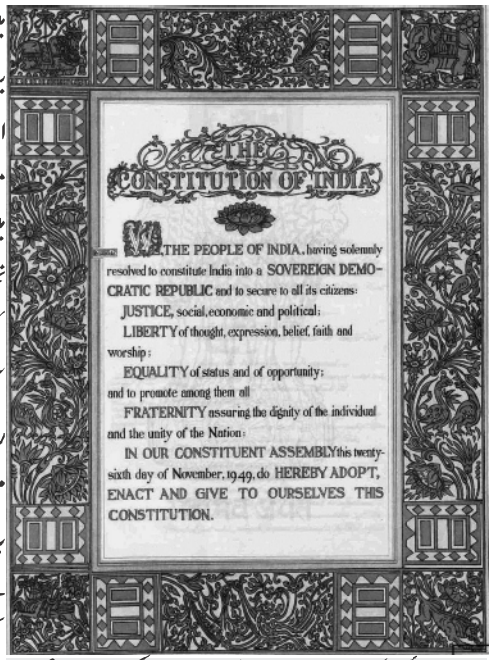
THE CONSTITUTION OF INDIA

WE, THE PEOPLE OF INDIA, having solemnly resolved to constitute India into a SOVEREIGN DEMOCRATIC REPUBLIC and to secure to all its citizens:

JUSTICE, social, economic and political;

LIBERTY of thought, expression, belief, faith and worship;

EQUALITY of status and of opportunity; and to promote among them all

FRATERNITY assuring the dignity of the individual and the unity of the Nation;

IN OUR CONSTITUENT ASSEMBLY this twenty-sixth day of November, 1949, do HEREBY ADOPT, ENACT AND GIVE TO OURSELVES THIS CONSTITUTION.

آئین کی اہمیت بنیادی ہے کیونکہ یہ تمام ملکی قوانین کا منبع و مخرج ہے۔ یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ آئین کی رو سے مذہب و ملت، ذات پات، علاقہ اور رنگ و نسل سے قطع نظر ہندستان میں تمام لوگوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں اور سب کو پھلنے پھولنے کا حق ہے۔ جمہوریت کے قیام کے لیے جمہور میں خود اعتمادی اور قانون پسندی بنیادی اجزا ہیں۔ ہر ہندوستانی کو آئین سے واقفیت ہونی چاہئے تاکہ وہ اپنے حقوق بھی جانے اور فرائض سے بھی آگاہ ہو۔ اسی سے امن، قومی یک جہتی اور خوشحالی کے سلسلے استوار ہوتے ہیں۔

آئین عمل میں آیا اسی وقت سے پورے ہندوستان میں یہ دن ایک جشن کے طور پر منایا جاتا ہے اور اس یاد گار کو تازہ کیا جاتا ہے۔ 26 رجنوری 1950ء آزاد ہندوستان کا دستور نافذ ہوا۔ دستور کی روشنی میں ہندوستان ایک مکمل اختیار والی عوامی جمہوریہ ہے۔ تمہید میں غیر مبہم الفاظ میں کہا گیا ہے کہ انصاف، آزادی، برابری، بھائی چارہ دستور کے مقاصد ہیں۔ دستور کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ فیڈریشن ہونے کے باوجود اس کا مقصد یونین کے استحکام کے لیے تمام بنیادی معاملات میں یکسانیت پیدا کرنا و جاری رکھنا ہے۔ دستور کے تحت نظام عدالت، ضابطہ دیوانی، فوجداری اور خاص کر کل ہند ملازمتوں کے بارے میں یکساں قوانین ہیں۔ آئین کے تحت یونین ناقابل تقسیم ہے اور کوئی بھی ریاست یونین سے نہ الگ ہو سکتی ہے اور نہ ہی دستور مرتب کر سکتی ہے۔ دستور کا دوسرا امتیازی پہلو یہ ہے کہ یہ حالات کے تقاضے کے مطابق وحدانی بھی ہو سکتا ہے۔ عام حالات میں حکومت فیڈرل انداز سے کام کرے گی۔ لیکن جنگ یا دوسرے ہنگامی حالات میں پورا ملک ایک اجتماعی صورت اختیار کر لے گا۔ دستور کے تحت حالانکہ رئیس مملکت کو (President) یعنی صدر کہا جائے گا لیکن حکومت کی بنیاد امریکی طرز پر نہیں بلکہ پارلیمانی طرز کی جمہوریت پر رکھی گئی ہے۔ اس طرح صدر اپنے عاملانہ اختیار وزیروں ہی کے مشورے سے استعمال کرے گا۔ یہ وزیر پالیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اور چونکہ پارلیمنٹ کے ارکان بالغ الرائے دہندگی کی بنیاد پر منتخب ہوں گے اس لیے وہی عوامی حکومت چلانے کے لیے ذمہ دار

ہوں گے۔ پارلیمانی طرز کی ذمہ دار حکومت کا اصول اس تجربے کو پیش نظر رکھ کر اختیار کیا گیا ہے جو متعدد برسوں تک ہندوستان کے صوبوں میں اس طرز کی حکومت رائج ہونے سے حاصل کیا گیا ہے۔ ہندوستان کا دستور دنیا کی تاریخ میں ایک نیا اور بہت بڑا تجربہ ہے۔ یہ دستور چھوت چھات اور مذہبی امتیاز کے خاتمہ کی ضمانت ہے۔ اس کی رو سے ہر شخص کو مذہب وملت اور ذات کے لحاظ کے بغیر ایک جیسے حقوق حاصل ہوئے ہیں۔ دستور نے ریاستوں کی مطلق العنانی ختم کردی ہے، عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینے کی ذمہ داری عائد کی ہے ساتھ ہی ہر شخص تحریر وتقریر کے معاملہ میں آزاد ہے۔

دستور کی چند خصوصیتیں

منظوری کے وقت ہندوستانی دستور میں کل ۳۵۹ دفعات اور آٹھ شیڈول تھے۔ بعد کی ترمیموں سے بعض دفعات نکل گئیں اور بعض کا اضافہ کیا گیا۔ دستور کے مرتبین نے دیگر جمہوری ممالک کے کانسٹی ٹیوشن کو سامنے رکھا ہے۔ مثلاً ہندوستانی صدر کے اختیار جرمن جمہوریہ کے صدر کا چربہ ہیں۔ ساتھ ہی 1935ء کے گورمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی بہت سی دفعات کو لفظ بہ لفظ موجودہ کانسٹی ٹیوشن میں جگہ دی گئی ہے۔

دستور نے ہندوستانی عوام کو سرچشمہ اقتدار مانا ہے۔ اس کو صاف اور کھلے ہوئے لفظوں میں دستور کی تمہید میں بیان کیا گیا ہے۔ دستور نے ہندوستان کو ایک بااقتدار، خود مختار عوامی جمہوریہ (Sovereign Democratic Republic) مانا ہے نیز بلاتفریق وامتیاز، مذہب وملت، جنس ورنگ اور ذات پات ہر بالغ ہندوستانی کو حکومت کی تشکیل میں ووٹ کا حق دیا ہے۔ اور انہیں ووٹوں سے مرکز اور ریاستوں میں حکومتیں قائم ہوتی ہیں۔ غیر مذہبی جمہوریت (Secular Democracy) دستور کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ملک میں غیر مذہبی جمہوریت قائم کی ہے۔ ہندوستان کو طویل جدوجہد کے بعد آزادی کی نعمت حاصل ہوئی، جس کے لیے ہمارے اسلاف نے زبردست قربانیوں کا نذرانہ پیش کیا، جان و مال کی قربانیاں دیں، تحریکیں چلائیں تختۂ دار پر چڑھے، پھانسی کے پھندے کو جرات وحوصلہ اور کمال بہادری کے ساتھ بخوشی گلے لگایا، قید وبند کی صعوبتیں جھلیں اور حصولِ آزادی کی خاطر میدان جنگ میں نکل پڑے، آخر غیر ملکی (انگریز) ملک سے نکل جانے پر مجبور ہوئے۔ غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے طرح طرح کی چالیں چلیں، تدبیریں کیں، رشوتیں دیں، لالچ دیئے، پھوٹ ڈالوں اور حکومت کرو کا اصول بڑے پیمانے پر اختیار کیا، فرقہ وارانہ

> جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کمزور ترین فرد کو انتہائی شہ زور کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔
> (مہاتما گاندھی)

اختلافات پیدا کیے، حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا، آپس میں غلط فہمیاں پھیلائیں، تاریخ کو مسخ کیا، انگریزوں نے ہندوستان کے معصوم باشندوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے اور ناحق لوگوں کو تختۂ دار پر لٹکایا، ہندوستانیوں پر ناحق گولیاں چلائیں، چلتی ریلوں پر سے اٹھا کر باہر پھینکا؛ مگر ان کے ظلم وستم کو روکنے اور طوقِ غلامی کو گردن سے نکالنے کے لیے بہادر مجاہدین آزادی نے ان کا مقابلہ کیا اور ملک کو آزاد کرکے ہی اطمینان کا سانس لیا۔ 26/جنوری 1950ء آزاد ہندوستان کا دستور نافذ ہوا۔ دستور کی روشنی میں ہندوستان ایک مکمل اختیار والی عوامی جمہوریہ ہے۔ تمہید میں غیر مبہم الفاظ میں کہا گیا ہے کہ انصاف، آزادی، برابری، بھائی چارہ دستور کے مقاصد ہیں۔

اسٹیٹ کا کوئی مذہب نہیں ہے اور ہر مذہب کو یکساں حیثیت حاصل ہے۔ دوسرے ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ کسی بھی مذہب کے ماننے والے ہوں ایک مشترک شہریت میں منسلک کردیئے گئے ہیں۔ ہر ہندوستانی شہری کو اسٹیٹ سے متمتع اور اس سے فائدہ اٹھانے کا پورا حق ہے۔ مذہب یا ذات پات یا کسی خاص علاقہ یا ریاست میں پیدا ہونے کی بنا پر کسی ہندوستانی کو شہریت کے کسی حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کے ساتھ کسی قسم کی تفریق کی جاسکتی ہے۔ وفاقی ڈھانچہ (Federal Structure) جمہوریہ ہند کا دستور وفاقی یا Federal ہے۔ اس میں وفاقی دستور کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ ایک لکھی ہوئی دستاویز (written document) ہے جس میں مرکز اور ریاستوں کے اختیارات کو صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ برسر اقتدار سیاسی جماعتوں سے بلند اور بالا غیر جانبدار عدلیہ (judiciary) قائم کی ہے۔ جسے مرکز اور ریاستوں کے درمیان اختلافی چیزوں کے فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ساتھ ہی عدلیہ کو دستور کی تعبیر اور تشریح کا حق بھی حاصل ہے لیکن ہندوستانی فیڈریشن اور امریکن فیڈریشن اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس کا مرکز زیادہ وسیع اختیارات کا مالک ہے۔ جن امور کو مشترک (concurrent) یا ریاستی امور کی فہرست میں نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ سب مرکز یا یونین حکومت کے دائرہ اختیار میں ہیں۔ ان کے بارے میں قانون بنانے اور ان پر کارروائی کرنے کا حق مرکزی حکومت کو حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ مرکز کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ ریاستوں کو اہم مسئلوں میں مشترک اور یکساں پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ مرکزی حکومت کی صورت سے ہندوستانی فیڈریشن خاصا لچک دار (flexible) ہے۔ ہنگامی صورت حال (emergency) میں مرکزی حکومت، ریاستی حکومتوں کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔

بنیادی حقوق (Fundamental Rights) ہر آزاد جمہوریہ ملک میں شہریوں کو کچھ ایسے حقوق حاصل ہوتے ہیں جن سے ان کو محروم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حقوق شہریوں کے لیے اتنے ضروری ہوتے ہیں کہ ان کے بغیر وہ اپنی شخصیت کی تعمیر نہیں کرسکتے۔ ہمارے ملک کے دستور میں شہریوں کے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی رو سے ہر شہری خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی قانون کی نگاہ میں برابر ہے۔ مذہب، ذات پات، جنس، رنگ یا جائے پیدائش کی بنا پر کسی کے خلاف کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شہری کو آزادئ خیال اور آزادئ مذہب حاصل ہے۔ ساتھی ہی ہر شہری کو سرکاری ملازمتیں نیز بڑے سے بڑا عہدہ بلا امتیاز وتفریق حاصل کرنے کا حق ہے۔ دستور نے صدیوں سے چلے آرہے چھوت چھات کے رواج کو جرم قرار دیا ہے اور اقلیتوں کو مذہبی وتمدنی آزادی دی ہے۔ انہیں اس بات کا بھی حق دیا ہے کہ وہ اپنے علیحدہ اسکول اور تعلیمی ادارے قائم کریں۔ اپنی تہذیب یا تمدن، زبان اور رسم الخط (script) کو قائم وبرقرار رکھیں اور انہیں ترقی دیں۔ ساتھ ہی مخصوص مذہب کی تبلیغ اور مذہبی مراسم ادا کرسکیں۔

دستور کی لچک (Flexibiligy) ایک اچھے دستور کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے اور بدلنے کی صلاحیت موجود ہو۔ لہٰذا دستور کو بدلنے اور ضروری ترمیمیں کرنے کے لیے سیدھا اور آسان طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

قبائلی (Tribe) اور پسماندہ (Bacward) علاقوں کے لیے مخصوص دفعات: ہندوستان میں آج بھی ایسے بے شمار قبائل موجود ہیں جو تہذیب وتمدن کے اعتبار سے بہت پچھڑے ہوئے ہیں۔ ان قبیلوں اور علاقوں کا اس طرح پچھڑے رہنا ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لیے از حد مضر ہے۔ اس لیے دستور اساسی میں ان کی ترقی کے لیے مخصوص دفعات رکھی گئی ہیں۔ تاکہ پسماندہ اور پچھڑے ہوئے قبیلے اور علاقے ترقی وخوشحالی حاصل کرسکیں۔ اس تعلق سے مخصوص دفعات کا مطلب یہ ہے ان علاقوں اور قبیلوں کی بہبودی کو مدنظر رکھا جائے گا تاہم اور خاص یوم جمہوریہ تقریبات نئی دہلی میں منعقد کی جاتی ہیں۔ اس دن صدر جمہوریہ کی زیر صدارت اور موجودگی میں یہ تقریبات اور اجلاس بڑے ہی دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں۔ ان تقریبات کا اہم مقصد ہندوستان کو خراج پیش کرنا ہوتا ہے۔ 1950ء سے ہندوستان اپنی ان تقریبات میں دنیا کے مختلف ممالک کے صدور اور وزرائے اعظم کو بحیثیت مہمان خصوصی مدعو کرتا آرہا ہے۔ ان تقریبات کے اجلاسات مختلف مقامات پر منعقد ہوتے ہیں، خصوصاً یہ اجلاس دہلی کے راج پتھ پر منعقد ہوتا ہے۔ مہمان ملک کی حیثیت سے اس ملک کو

> اگر کسی مسئلے پر محض ایک شخص کی رائے سماج کے سارے افراد سے بالکل مختلف ہو تو بھی ان سارے افراد کو ایک شخص کو خاموش کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔
>
> (جان اسٹوریٹ مل)

مدعو کیا جاتا ہے، جس کا تعلق ہندوستان کے ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی رجحانات پر مبنی ہے۔ بالخصوص، غیر جانبدار اور مشرقی بلاک کے ممالک۔ سرد جنگ کے دوران بھی مغربی ممالک کو مدعو کیا گیا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ مدعو کئے جانے والے ممالک میں بھوٹان، سری لنکا، روس، فرانس اور برطانیہ شامل ہیں۔ غیر جانبدار ممالک جیسے نائجیریا، یوگوسلیویا، ماریشس بھی شامل ہیں۔ ملک بھر میں ہر ریاست، ضلع اور یہاں تک کے اسکول اور مدارس میں بھی یہ تقریبات منائی جاتی ہیں۔ ملک کے باہر بھی، وہ ممالک اور مقامات جہاں ہندوستانی عوام رہتی ہیں، یہ تقریبات منائی جاتی ہیں۔ اسکولوں، مذہبی مدارس اور تعلیم گاہوں کو خوب سجایا جاتا ہے، طلبا کے لیے یہ ایک بیحد خوشی کا موقع ہوتا ہے۔ تقریب میں بھارت کی فوجی طاقتیں بھارتی فوج، بھارتی بحریہ اور فضائیہ کے بینڈ پیش کیے جاتے ہیں۔ اس تقریب کا انعقاد رئیسینا ہلز اور اس کے نزدیک واقع وجے چوک پر ہوتا ہے۔ اس اجلاس کی صدارت بھارت کے صدر کرتے ہیں۔ جیسے ہی صدر صاحب اس مقام پر پہنچتے ہیں، قومی سلامی دی جاتی ہے اور جن گن من گایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملیٹری بینڈ بجائے جاتے ہیں، جن میں مختلف اقسام کے طاش، نقارے، ساز، باجے، ٹرمپیٹ شامل ہیں۔ اس ترانے کے علاوہ مہاتما گاندھی کا گیت گایا جاتا ہے اور آخر میں ہندی ترانہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا گایا جاتا ہے۔ یوم جمہوریہ جمہوریت کا نام سنتے ہی ذہن میں لاشعوری طور پر ابراہم لنکن کے یہ الفاظ ابھرتے ہیں: ''جمہوریت عوام کی، عوام کے لئے اور عوام کے ذریعہ کی جانے والی حکومت کا نام ہے۔'' لیکن آج جن وسیع معنوں میں ہم جمہورت کا لفظ استعمال کرتے ہیں لنکن کے الفاظ اس کی مکمل ترجمانی نہیں کرتے۔ جمہوریت محض ایک طرز حکومت ہی نہیں ہے' اقتصادی نظام کا سرچشمہ بھی ہے۔ جمہوریت ایک مخصوص انداز فکر' ایک زاویہ نظر' ایک طرز عمل اور ایک مخصوص ذہنی کیفیت کا نام ہے۔

جس طرح ایک غافل اور نااہل حکمراں اقتدار سے محروم ہوجاتا ہے اسی طرح اگر عوام غفلت اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے رہیں تو جمہوریت کی گاڑی ایک دن پٹری سے اتر جاتی ہے لہٰذا ہندوستان کے ہر شہری کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے نمائندوں پر نظر رکھے ان کو آزاد نہ چھوڑے بلکہ فرض کی ادائیگی اور وعدوں کو پورا۔ کسی شئے کا صحیح اور بہتر استعمال ہی اس کی کامیابی کی دلیل ہوا کرتا ہے اس لئے جمہوریت کی بقاء، یا کامیابی اور اس کی خوبیوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ ہم اپنے نمائندوں کا صحیح اور بہتر مصرف سمجھیں ان کو وہی کام کرنے پر مجبور کریں جو ان کے فرائض میں شامل ہیں اور جن سے ملک اور عوام کو فائدہ

پہنچ سکتا ہے اسی طرح ہم جمہوریت کی آبیاری اور ملک وقوم کی ترقی کا کام انجام دے سکتے ہیں لہٰذا آزادی کے ۶۹ سال پورے ہونے کے اس سال کے دوران ہندوستانی عوام کو اس بات کا عہد کرنا چاہئے کہ وہ یہ کام انجام دیں گے۔ یہ دنیا کے ہر فرد کو ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہوکر شانہ بہ شانہ چلنے کی دعوت دیتی ہے اور ہر شخص کو یہ پیغام دیتی ہے کہ ''زندہ رہو اور زندہ رہنے کا موقع دو'' اگر ہم جمہوریت کی اس دعوت کو صدق دل سے قبول کرلیں تو ہم آزادی' مساوات اور اخوت کے اصولوں پر مبنی ایک عالمی برادری کی تشکیل بہ آسانی کرسکتے ہیں۔ آیئے ہم سب مل کر یہ عہد کریں کہ ہم اپنی قومی اور بین الاقوامی زندگی میں ہر فرد اور ہر ملک کے حقوق کا احترام کریں گے اور مذہبی' انسانی اور علاقائی تعصب سے اوپر اٹھ کر تمام عالم انسانیت کے دکھ درد کو بانٹنے کے لئے تیار رہیں گے اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اکثریتی حکومت کی کامیابی کا راز اقلیتوں کے تحفظ اور خوشحالی میں پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ مہاتما گاندھی نے بھی کہا تھا:

''جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کمزور ترین فرد کو انتہائی شہ زور کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔''

بدقسمتی سے ہندوستان میں آج جمہوریت کے نام لیواؤں، دعویداروں اور پرستاروں کی تعداد جتنی زیادہ ہے جمہوریت پر سچا یقین رکھنے والوں، اس کے حقیقی مفہوم سے روشناس کرانے والوں اور اس پر خلوص دل سے عمل پیرا ہونے والوں کی تعداد اتنی ہی کم ہے۔ جمہوریت کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ ہر فرد انسان ہونے کے ناطے برابر ہے۔ وہ آزاد پیدا ہوتا ہے' اس لئے زندہ رہنے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے اپنی شخصیت کی نشوونما اور اپنی زندگی کی تعمیر وتشکیل کرنے کا اسے پورا موقع ملنا چاہئے۔ کوئی بھی فرد دوسرے کے مقاصد کی تکمیل کے لئے آلۂ کار نہیں ہے۔ مشہور انگریز مفکر جان اسٹیوریٹ مل کے الفاظ میں ''ہر فرد اپنی ذات' اپنے ذہن اور اپنے جسم کا مالک ہے'' یعنی ہمارے وجود اور ہماری صلاحیتوں کو دوسروں کے مفاد کے لئے ہماری مرضی کے خلاف استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ایک طرزِ حکومت کی حیثیت سے جمہوریت اس سیاسی نظام کو کہتے ہیں' جس میں عوام اقتدار اعلیٰ کے امین ہوتے ہیں' جس میں حکومت کو بنانے اور بدلنے کا مکمل اختیار عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور جس میں عوام حکومت کے لئے نہیں' حکومت عوام کے لئے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری حکومت عوام کے سامنے جوابدہ اور ذمہ دار ہوتی ہے۔ جمہوریت کی اساس طاقت پر نہ ہوکر رائے عامہ پر ہوتی ہے۔

جمہوریت آزادی اور مساوات کی خالق بھی ہے اور محافظ بھی۔ آزادی اور مساوات جمہوریت کے ستون ہیں۔ لیکن جمہوریت میں آزادی کا مطلب غیر محدود طریقے پر اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا استعمال کرنا نہیں ہے۔ آزادی سے مراد کچھ معقول پابندیوں میں رہتے ہوئے اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے۔ اگر ہر شخص کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ جو کچھ کرسکتا ہو کرے تو سماج میں افراتفری پیدا ہوجائے گی۔ اس طرح کی آزادی پوری سماجی زندگی کو درہم برہم کردے گی اور فرد کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ ایسی صورت میں آزادی سماج کے چند طاقتور افراد کا حق بن کر رہ جائے گی اور سماج کے بیشتر افراد جسمانی اعتبار سے کمزور ہونے کے سبب آزادی سے سانس لینے کے حق سے بھی محروم ہوجائیں گے۔

جمہوریت جس آزادی کا پیغام دیتی ہے وہ پابندیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ پابندیاں بظاہر ایک شخص کو اس بات کے لئے مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنی فطری قوتوں کو من مانے ڈھنگ سے استعمال نہ کرے' لیکن ان کا مقصد آزادی کو سلب کرنے کے بجائے سماج کے بیشتر افراد کو آزاد رہنے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ یہ پابندیاں حقوق وفرائض کو جنم دیتی ہیں۔ ایک مہذب معاشرے میں یہ پابندیاں قانون کے ذریعہ عائد کی جاتی ہیں۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ قانون آزادی کا خالق اور محافظ ہے' لیکن یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب قانون بنانے والی طاقت یعنی حکومت کی بنیاد طاقت پر نہ ہوکر رائے عامہ پر ہو' جمہوریت ہی وہ طرزِ حکومت ہے جو سیاسی امور میں ہر فرد کے برابر حق کو تسلیم کرتی ہے اور جس میں ہر شخص حاکم بھی ہے اور محکوم بھی۔ اسی لئے جمہوریت میں ہی ہر فرد صحیح معنوں میں آزاد رہ سکتا ہے۔

حکومت کے قوانین قدم قدم پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ ہمیں کچھ کرنے یا نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ بظاہر ان قوانین سے ہمیں فطری آزادی محدود ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ان پابندیوں سے بھی مساوات کا جنم ہوتا ہے۔ جب ہم مساوات کی بات کرتے ہیں تو اس کے معنی یکسانیت یا یک رنگی سے نہیں ہیں۔ ہر شخص ایک سی صلاحیتیں لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر شخص کو ہر معاملے میں ایک سا بنا دینا ناممکن ہے۔ جمہوریت میں مساوات کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کی طرف سے ملنے والی سہولتیں اور مواقع ہر شخص کو مساوی طور پر حاصل ہوں۔ حقیقی معنوں میں سیاسی زندگی میں مساوات اسی وقت ممکن ہے جب قانون کو افضلیت حاصل ہو۔ جسے ہم ''رول آف لا'' یا قانون راج کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فیصلوں کا انحصار کسی فرد کی خوشی یا ناخوشی پر نہ ہوکر قانون پر ہو۔ جمہوریت میں ہر شخص کو غور وفکر اور اظہار خیال کی آزادی ہوتی ہے تاکہ ہم اپنی آواز کو حکومت تک بلاخوف وخطر پہنچا سکیں اور حکومت رائے عامہ کے مطابق فیصلے کرسکیں۔

❑❑❑

یوم جمہور

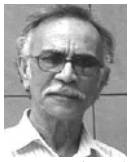

ڈاکٹر ذکی طارق
564، کیلا روڈ، گوشالا پھاٹک، غازی آباد
موبائل: 9818860029

مادرِ ہند مری ارض وطن خاک وطن
جگمگاتی سی تری دھرتی چمکتا سا گگن
تیرے قدموں پہ فدا ہوتی ہے سورج کی کرن
خلد ساماں نظر آتے ہیں ترے سارے چمن
تری عظمت تری حُرمت تری رفعت کو سلام

صبح دلکش ہے تری شام سہانی تیری
ساری دنیا کے لبوں پر ہے کہانی تیری
لذّت آمیز ہے ہر دور کے انساں کے لیے
اے میری روحِ جہاں شیریں بیانی تیری
کس قدر شان سے ہے صدیوں سے تو جلوہ فگن
تری عظمت تری حُرمت تری رفعت کو سلام

نور ہی نور ہے رعنائی ہی رعنائی ہے
عرض کیا کیجیے کیسی چمن آرائی ہے
نغمۂ عیش مچلتا ہے گلوں کے لب پر
پھول تو پھول ہے کانٹوں پہ بہار آئی ہے
دل سے معدوم نظر آتے ہیں سب رنج محن
تری عظمت تری حُرمت تری رفعت کو سلام

نشّہ جمہور کا ہر ذہن پہ ہے چھایا ہوا
جس کو دیکھو وہ نظر آتا ہے اتراتا ہوا
ہم کو آزادی ملی ختم ہوا دورِ ستم
پرچم امن ہر اک سمت ہے لہرایا ہوا
اپنی تقدیر پہ ہر شخص ہے مسرور و مگن
تری عظمت تری حُرمت تری رفعت کو سلام

آج کا دن یہی دیتا ہے محبت کا پیام
ہاتھ میں ہاتھ لیے پھرتے ہیں سب گام بہ گام
بھائی چارے کی فضا چاروں طرف ہو قائم
نہ کوئی آقا رہے اور نہ رہے کوئی غلام
یوں رہیں مل کے سبھی جیسے ہیں یہ گنگ وجمن
مادرِ ہند مری ارضِ وطن خاکِ وطن
تری عظمت تری حُرمت تری رفعت کو سلام

دیدار اکبرپوری
سبزی منڈی چوک، لکھنؤ
موبائل: 9795555093

وطن کے نام

سلام خاکِ وطن کے ہر ایک ذرے کو
ستم کشانِ رہِ انقلاب پر ہو سلام
سلام ایسے جوانوں پہ، جن کی آنکھوں نے
خیالِ وصلِ زلیخائے آرزو سے پرے
بس ایک خواب ہی دیکھا تھا! صبح آزادی!!
انھیں کے پاک لہو سے ہے آبروئے شفق
انھیں کے خون سے رنگیں ہے صبح کا دامن
انھیں کے دم سے ہیں مٹی کی عظمتیں باقی
انھیں کے خون سے گلزار ہے فضائے چمن
مری رفیق، مجھے غیرتِ وفا نہ دلا
کہ تیرے حسنِ دلآویز سے کہیں زیادہ
مرے وطن کی محبت عزیز ہے مجھ کو
چلو یہ مان بھی لیتا ہوں دورِ افق سے پرے

نگاہِ ناز کو ہے میرا انتظار اب بھی
نفیس ہے لبِ لیلائے زندگی کی شراب
بہت حسین ہے دوشیزۂ بہار اب بھی
مگر یہ خاک کا رشتہ بھی کچھ تو ہوتا ہے
تری وفا کے تقاضے بجا سہی، لیکن
وطن پرستی کا جذبہ بھی کچھ تو ہوتا ہے
تمہارا حسن سلامت رہے قیامت تک
مجھے یہ خاک کی نسبت عزیز ہے، جاناں
تمام حرف ہر اک شعر، یہ مری لفظیں
مرا متاعِ سخن، میرے بے بہا آنسو
مرے قلم کی سیاہی، مرے بدن کا لہو
وطن کے نام
وطن کی محبتوں کے نام

گوشۂ عابد سہیل

جو یاد رہا

ممتاز صحافی اور ادیب عابد سہیل کو گزرے ہوئے دو سال ہوئے۔ ادارۂ 'نیا دور' ان کی دوسری برسی پر
بطور خراج ایک مختصر گوشہ کے طور پر ان کی سوانح 'جو یاد رہا' کے اقتباس کے ساتھ ان کے فن پر تین مضامین شائع کر رہا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو، نیا دور

پھر ایک دروازہ کھلا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے (شاید پہلے کی کیونکہ گل محمد شاہ میرے سامنے حیدر آباد ریڈیو اسٹیشن سے واپس آئے تھے) جب ریڈیو کے ڈراموں اور فیچروں میں حصہ لینے کے لئے میری آواز منظور ہوئی۔ جی ایم شاہ صاحب پروڈیوسر تھے۔ وہ ایک بار ڈرامے کی خواندگی اور تین بار ریہرسل کراتے۔ پھر ایک دن ڈرامہ نشر ہوتا، عام طور سے ساڑھے آٹھ بجے رات کے بعد۔ اس وقت تک پروگراموں کی ریکارڈنگ کی سہولت نہ تھی لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں تھا کیونکہ گراموفون تو بہت پہلے سے موجود تھے۔ ان دنوں ریڈیو آرٹسٹ بھی بہت زیادہ نہ تھے۔ اس لئے مہینے میں ایک پروگرام تو مل ہی جاتا۔ معاوضہ دس یا پندرہ روپئے ملتا، بیرئیر چیک کے ذریعہ جو حسین گنج کے پاس قندھاری بازار جانے والی سڑک کے نکڑ کی ایک دوکان سے ایک آنہ فی روپیہ (ایک آنہ برابر چھے سوا چھے پیسے) کمیشن پر اسی وقت کیش ہو جاتے۔ ریڈیو اسٹیشن کے سامنے سڑک کے دوسری جانب غالباً اس جگہ جہاں اب پنڈی ٹائر ہاؤس ہے مولانا کا ہوٹل تھا جس کے کباب بہت مشہور تھے۔ میں نے مجاز اور جلال لکھنوی کو کئی بار وہاں سے نکلتے دیکھا تھا لیکن مجاز سے میری دوستی تو دور کی بات قربت بھی نہ تھی۔ بس وہ مجھے پہچانتے تھے وہ بھی ڈاکٹر محمد حسن کے طفیل جنہوں نے ایک بار مجھے ان سے متعارف کرایا تھا۔ میں نے بھی ایک دو بار مولانا کے ہوٹل کے کباب کھانے کی عیاشی کی تھی۔

ہر مہینے چودہ پندرہ روپیوں کی آمدنی کے علاوہ یونین بلڈنگ میں دن بھر گزارنے کے مشغلے میں

ریڈیو کے پروگراموں نے پہلی سیندھ لگائی۔ ریڈیو کے پروگراموں نے اپنی اہمیت کا احساس بھی دلایا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہزاروں لاکھوں لوگ جو یہ پروگرام سن رہے ہوں گے اس میں حصہ لینے والوں کے ناموں کے اعلان سے مجھے پہچان بھی لیں گے۔ اس احساس نے کیرم کے کھیل میں لڑکوں کو پھانس کر ان کے پیسوں کی چائے سموسوں کو بے ذائقہ نہیں تو کم ذائقہ ضرور کر دیا۔ بعد میں ایک سرخاب کے پر کا اضافہ ہو گیا۔ کم سے کم میں یہی سمجھتا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کے پاس ہی چوراہے پر ایک بڑی سی عمارت 'رائل ہوٹل' کہلاتی۔ اب وہاں 'باپو بھون' ہے۔ اس عمارت سے ماہنامہ 'نیا دور' شائع ہوتا۔ یہ در اصل محکمۂ اطلاعات کا دفتر تھا۔ ان دنوں 'نیا دور' میں بچوں کا ایک گوشہ ہوتا تھا۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ اس گوشے میں میری چیزیں کب سے چھپنا شروع ہوئیں لیکن جہاں تک یاد پڑتا ہے ۱۹۵۵ء میں 'ہیئت کی اہمیت' کے نام سے ایک مضمون کے ذریعہ 'نیا دور' سے اس تعلق خاطر کی ابتدائی ہوئی جس کا سلسلہ جاری ہے۔ اس مضمون کا معاوضہ غالباً دس روپئے ملا تھا۔ لیکن 'بچوں کا گوشہ' میں بھی شاید میری دو ایک چیزیں شائع ہوئیں، کچھ دوسروں کے ناموں سے بھی۔ 'آجکل' کے بچوں کے گوشوں میں بھی میری کئی چیزیں اس سے پہلے شائع ہو چکی تھیں۔ ان دونوں رسالوں کے بچوں کے حصوں میں نصر اللہ خاں، اختر جمال، عبد الحلیم اور دو ایک دوسرے ناموں سے جو اب بھول گیا جو کچھ شائع ہوا وہ میرا ہی لکھا ہوا ہے لیکن مجھے نہیں یاد کہ 'نیا دور' میں ان فرضی ناموں سے میری کوئی چیز دوسری بار شائع ہوئی ہو۔ بچوں کے مضامین یا کہانیوں کے لئے 'نیا دور' سے دس روپئے اور 'آجکل' میں میرا پہلا مضمون

'ایورسٹ کی فتح' ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔ 'نیا دور' میں میرے مضامین کی اشاعت کے آغاز سے پہلے۔ اس مضمون کے سلسلہ میں عرش ملسیانی صاحب کا خط میرے پاس محفوظ ہے۔ اسی زمانے میں 'آجکل' میں میرے مضامین کی اشاعت شروع ہوئی، 'نیا دور' سے پہلے۔ اسی دوران ایک دن شری چند سے ملاقات ہو گئی جسے میں بھول سا گیا تھا۔ اب وہ اچاریہ نریندر دیو ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۱۲ میں رہتا تھا اور ایم اے کے پہلے سال میں تھا۔ میں نے پوچھا تو پتہ لگا کہ بی اے کے دوسرے ساتھ اکنامکس کے پرچے میں ہندی نے ساتھ نہیں دیا۔ اس طرح بی اے کے پہلے سال میں تین سال گزار چکا تھا۔ ریڈیو کے پروگراموں اور 'آجکل' اور 'نیا دور' میں مضامین کی اشاعت نے بے غیرتی کی اس چادر میں چھید کرنے شروع کئے جو میں نے گویا فخر سے اوڑھ رکھی تھی اور شری چند اور بشیر وارثی نے تو یہ چادر گویا جیسے نوچ کے پھینک دی۔ اس کارِ نیک میں اشفاق اور کبیر شاہ نے بھی کچھ نہ کچھ کردار ادا کیا۔ کبیر شاہ سے میری پہلی ملاقات ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر ریڈیو کے لئے کئی فیچر تیار کئے تھے۔ ان میں سے ایک بیربل ساہنی انسٹیٹیوٹ آف پولیو باٹنی پر بھی تھا۔ جہاں تک یاد ہے کبیر شاہ ہی نے مجھے افضال سے، جو بعد میں افضال احمد ایڈوکیٹ کے نام سے جانے گئے اور کئی کتابوں کے مرتب اور مصنف ہوئے، متعارف کرایا تھا۔

بھدوہی کے ایک بڑے تاجر کے بیٹے کا نام اشفاق تھا۔ اس سے جانے کیسے دوستی ہو گئی۔ یہ بھی نہ جانتا تھا کہ اس کے مضامین کیا ہیں۔ میں بی اے میں اتنے دنوں رہا کہ آدھے نہیں تو ان دنوں کے ایک چوتھائی طلبہ تو میرے کلاس فیلو ضرور رہے ہوں گے۔ اشفاق انہی میں سے ایک تھا۔

جاڑوں کے دن تھے۔ میں سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کئی سال پرانا کوٹ پہنے یونین بلڈنگ کی طرف جا رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو اشفاق تھا۔ حسب دستور ٹائی کے بغیر سوٹ پہنے ہوئے۔ ان کے کندھے پر ایک گرم کوٹ لٹک رہا تھا۔ اس نے کندھا اچکا کے نیا کوٹ ہاتھ میں لیا اور قبل اس کے کہ میں کچھ سمجھ سکوں میرا کوٹ بدن سے تقریباً کھینچ کر اس نے نیا کوٹ مجھے پہنا دیا اور ایسا منہ بنایا کہ میں ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ میری زبان جیسے گنگ ہو گئی، احتجاج تک نہ کر سکا، ایک لفظ منہ سے نہ نکلا۔ یہ بات ۱۹۵۵ء کی رہی ہوگی۔

بعد میں چند ملاقاتیں ہوئیں اور پھر آخری ملاقات غالباً ۱۹۹۵ء میں ہوئی۔ وہ بینک آف بڑودہ کے ڈائرکٹروں میں تھا۔ بینک کے ایک افسر سے بات چیت کے دوران جانے کیسے میرا نام آ گیا۔ اسی وقت انہیں ساتھ لے کر میرے یہاں آیا۔ ذرا سا گوشت چڑھ گیا تھا اور بس۔ بالکل وہی تھا۔ بینک آف بڑودہ کے جو صاحب اسے لے کر میرے پاس آئے تھے انہوں نے رٹائرمنٹ کے بعد خود اپنا بینک کھول لیا تھا۔ چار پانچ سو روپیوں کے شیئر میں نے بھی لئے تھے۔ افسوس دو سال قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ اب اسے اتفاق ہی کہئے، ان کا نام بھی اشفاق تھا۔

اب یونیورسٹی میرے لئے ایک نئی دنیا تھی۔ اساتذہ کو دیکھا تو پہلے بھی تھا، کلاس میں بھی، لیکن انہیں سمجھا اب اور ان کی خوبیوں کو پہچانا بھی۔ خوش قسمتی سے مجھے اساتذہ بہت اچھے ملے لیکن دو سال یونین بلڈنگ کے 'بن باس' میں ضائع کرنے کے بعد، اگرچہ اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا۔

سچ پوچھئے تو بی اے اب شروع ہوا تھا اور میرے پسندیدہ اساتذہ تھے فلسفہ کے ڈاکٹر این کے دیوراج، سوشیالوجی کے ڈاکٹر سیوارام اور ڈاکٹر سرن، انگریزی کے ڈاکٹر مترا، ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر خواجہ جمیل۔ کپلنگ پر ان کی ڈاکٹریٹ کی تھیسس کی بڑی شہرت تھی۔ مسٹر لمبا اخلاقیات (Ethics) پڑھاتے تھے۔ وہ بھی پسند تھے لیکن اس کا سبب کچھ اور تھا۔

قومی آواز

ایک دن منظر سلیم سے جنہیں میں نجی گفتگو میں ہمیشہ منظر بھائی کہتا، پل جھاؤ لال پر ملاقات ہو گئی۔ وہ کرسچین کالج کی طرف سے آ رہے تھے اور میرا رُخ اسی طرف تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی اپنی سائیکلوں سے اتر پڑے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔

گفتگو کا آغاز منظر بھائی نے ہی کیا

'قومی آواز میں نوکری کیجئے گا؟'

'مجھے مل جائے گی؟'

'آپ کو نہیں ملے گی تو کس کو ملے گی؟' انہوں نے جواب دیا۔ قومی آواز پر میرا تھوڑا سا حق تھا۔ پانچ سال تک یونیورسٹی میں اعزازی نامہ نگاری کرنے کے سبب اس کے مزاج سے کچھ نہ کچھ واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے مزاج سے انحراف کس حد تک برداشت کر لیتا ہے۔ ان پانچ برسوں میں قومی آواز بائیں بازو سے میری ہمدردیوں کو برداشت کرتا رہا تھا اور میں نے بھی کبھی اپنے سیاسی نظریات کو خبر یا سرخی کے ذریعہ اخبار پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مقررہ تاریخ اور وقت پر قومی آواز پہنچا تو منظر سلیم پہلے عشرت صاحب کے پاس لے گئے پھر حیات اللہ انصاری کے پاس۔ ظاہر ہے ان ملاقاتوں کی نوعیت رسمی تھی کیونکہ دونوں مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ عشرت صاحب سے تو قرابت داری بھی تھی لیکن اس سے نقصان کا امکان زیادہ تھا۔ وہ خود کو غیر جانبدار ثابت کرنے کے لئے دوسرے کے جانبدار بھی ہو سکتے تھے۔ بہر حال طے یہ

پایا کہ میں اگلے دن رات کی ڈیوٹی میں سات بجے شام کو دفتر پہنچوں۔ یہ بات ۱۹۵۷ء کی ہے۔ ریاستی اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے اور ہر روز تھوڑے بہت کانگریسی امیدواروں کے نام کا اعلان ہوتا جس دن میں قومی آواز میں Apprentice سب ایڈیٹر کی حیثیت سے پہلی بار گیا، اسی دن ٹھاکر ہرگووند سنگھ نے اپنی جگہ پر کسی اور کو ٹکٹ دئے جانے کے خلاف بطور احتجاج پارٹی سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس واقعے سے متعلق دو خبریں مجھے دی گئیں۔ ان دنوں خبریں اردو میں آتی تھیں نہ ہندی میں اور یو پی آئی (یونائیٹڈ پریس آف انڈیا) نام کی صرف ایک نیوز ایجنسی سارے ملک کو انگریزی میں خبریں فراہم کرتی تھی، چنانچہ اردو اخبار میں کام کرنا انگریزی سے واقفیت اور ترجمے کی صلاحیت کا امتحان بھی ہوتا۔ ایک بات اور بھی تھی۔ اردو اور ہندی اخباروں میں کام کرنے والے کو پتہ ماری کا عادی ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ ان دنوں آج کے مقابلے میں کسی قدر مشکل انگریزی کا رواج تھا اور اردو کی حد تک صحت زبان کے سلسلہ میں اخبار پڑھنے والوں کے مطالبات آج سے کہیں زیادہ ہوتے۔ قومی آواز میں تو زبان و بیان کی غلطی پر کبھی کبھی مولانا آزاد تک حیات اللہ انصاری کو خط لکھ دیتے تھے۔

میں نے دونوں خبروں کا ترجمہ بہت محنت سے کیا اور سرخی لگا کر کاپی مسیح الحسن رضوی کو دے دی۔ سرخی دیکھ کر وہ مسکرائے تھے لیکن اس مسکراہٹ کا راز اگلے دن کھلا جب ان دونوں خبروں کی سرخیاں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ میری دی ہوئی سرخی تو شاید آٹھ کالموں میں بھی نہ سما پاتی۔ ترجمہ کی غلطیاں بھی درست کی گئی تھیں لیکن اس کی نوبت کم کم ہی آئی تھی۔ دو دن بعد منظر سلیم نے مجھ سے کہا عشرت صاحب کہہ رہے تھے زیادہ تعریف نہ کرنا ورنہ دماغ خراب ہو جائے گا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ بات عشرت علی صدیقی کے مزاج سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ ان دنوں واضح الفاظ میں میرے کام کی تعریف و توصیف تو کسی نے نہ کی لیکن مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ محمد حسن قدوائی اور مسیح الحسن رضوی میرے کام سے خاصے مطمئن ہیں۔ تاہم بعد میں نو آموز کار کی حیثیت سے میرا تین مہینے کا تقرر مزید تین ماہ کے لئے بڑھا دیا گیا۔ اس کے معنی میں نے یہ نکالے کہ میرے کام میں کم سے کم ایک آنچ کی کسر ضرور ہے چنانچہ زیادہ محنت سے کام کرنے لگا اور مزید تین مہینے کی مدت پوری ہونے کے لئے ایک ایک دن کا انتظار۔ یہ تین مہینے پورے ہوئے تو ایک پریشان کن صورت حال پیدا ہو

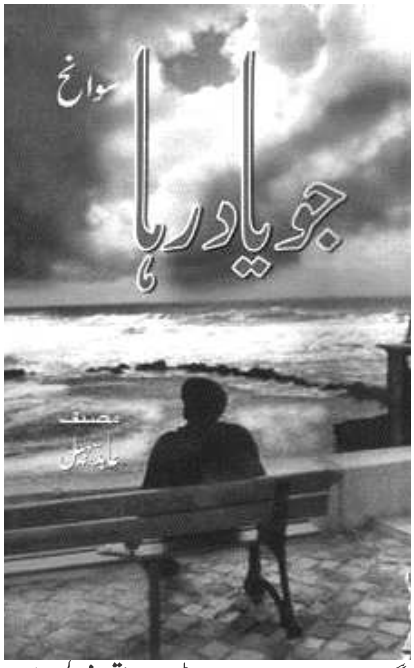

گئی۔ میرے دوست اور پارٹی کے ساتھی نجم الحسن بھی اس جگہ کے لئے امیدوار ہو گئے۔ نجم الحسن کی امیدواری کی حیثیت سے سامنے آنا تھا کہ میرے ایک حامی کسی قدر غیر جانبداری کا مظاہرہ کرنے لگے۔ اب منظر سلیم کے علاوہ دفتر میں کوئی بھی کھلے عام میرا حمایتی نہ رہ گیا۔ اس وقت کرنل بشیر حسین زیدی ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین تھے۔

یہ صورت ظاہر ہے میرے لئے پریشان کن تھی کیونکہ اسی روپیوں کی ملازمت اور سو روپیوں کے اسلم رضوی کے یہاں کے ٹیوشن پر چار زندگیوں ..... بیوہ ماں، دو چھوٹے بھائی بہن اور میری بنیادی ضرورتوں کا انحصار تھا۔ میں مہینے میں ریڈیو کے پندرہ روپیوں کے ایک آدھ پروگرام اور 'آجکل' یا 'نیا دور' سے کبھی کبھی پچیس تیس روپئے کما لیتا۔ سلائی کڑھائی سے اماں کی بھی کچھ نہ کچھ یافت ہو جاتی لیکن اس طرح کہیں گھر گرہستی چلتی ہے۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا کہ اُورئی میں اماں جس مکان میں رہتی ہیں وہاں سے ہم لوگوں کے تینوں مکان ایک فرلانگ بھی نہیں تھے۔ وہ کبھی ادھر سے گزرتی ہوں گی تو ان مکانوں کو دیکھ کر ان پر کیا بیت نہ جاتی ہوگی۔ صبح شام اسی ادھیڑ بن میں گزر رہے تھے کہ ایک دن حیات اللہ انصاری نے بلایا اور کہا۔

'اب دو امیدوار ہو گئے ہیں۔ آپ دونوں کا مقابلہ ہو جائے۔' یہ کہہ کر وہ ذرا سا مسکرائے۔

'میں کسی مقابلے میں نہیں بیٹھوں گا' میں نے کہا۔

'کیوں؟ کیا آپ ان سے ڈرتے ہیں؟'

'جی نہیں' میں نے کہا 'ڈرتا نہیں لیکن ایک تو نجمل میرے دوست ہیں اور دوسرے یہ کہ میری چھوٹی موٹی ادبی حیثیت ہے (اللہ اللہ، کیا کیا خوش فہمیاں تھیں ان دنوں) اور آپ کسی دباؤ یا مصلحت کے تحت انہیں لینے پر مجبور ہو گئے تو کہیں گے یہی کہ وہ بہتر صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ میں آپ کو اس کا موقع نہیں دینا چاہتا۔'

جملہ بیحد سخت تھا اور اس عمر ہی میں ممکن تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حیات اللہ انصاری میرے اس جواب کے بعد اپنی فراگ چیئر پر نیم دراز ہو گئے تھے۔ ان کا ایک ہاتھ کرسی کے چوڑے ہتھے پر تھا جس پر پیڈ رکھ کر وہ اداریہ لکھتے تھے اور دوسرا پیشانی پر۔ انہوں نے مجھ سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔

'آپ کام کرتے رہیے، میں بعد میں بتاؤں گا۔'

اور انہوں نے اسی دن کسی مقابلہ کے بغیر میری ملازمت مستقل کر دی۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ تقرر میرا ہی ہوگا لیکن میں چھ مہینے کی نو آموز کاری اور پانچ سال تک یونیورسٹی کی نامہ نگاری کے بعد کسی ایک شخص سے

مقابلہ کے لئے تیار نہ تھا جسے اخبار میں کام کرنے کا ایک دن کا بھی تجربہ نہ ہو۔ پھر بھی میں نے سوچا تھا میرے موافق فیصلے میں تین چیزیں حائل ہوسکتی تھیں۔ کرنل زیدی کی نجم الحسن کو حمایت، ایک موقع پر لٹریسی ہاؤس کی ملازمت کی حیات اللہ انصاری کی پیشکش قبول کرنے سے میرا انکار اور ایک غیر متعلق لیکن دلچسپ واقعہ۔ اب وہ واقعہ سن لیجئے۔

ایک دن حیات اللہ صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور سلطانہ حیات صاحبہ کی جانب، جو وہاں موجود تھیں، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ 'یہ آپ کے لئے ایک تجویز لے کر آئی ہیں۔ ایک آدھ دن میں کسی وقت گھر تشریف لائیے۔' تجویز کے معنی بالکل نہ سمجھنے کے باوجود میں نے فوراً ہامی بھر لی تھی۔ یوں بھی کیا کوئی نوآموز کار اس وقت 'تجویز' کے معنی پوچھ سکتا تھا؟ خیر، منگل کا دن مقرر ہوا۔ میں پہنچا تو سلطانہ حیات کو کچھ زیادہ ہی مہربان پایا۔ تھوڑی دیر میں ناشتہ آ گیا۔ چائے، بسکٹ اور خشک و تر میوے اور اس سب کے ساتھ ایک کالی سی خاتون جو کھادی کے کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ تعارف ہوا، شکل وصورت اور باقی باتیں تو یاد ہیں لیکن نام بالکل بھول گیا ہوں۔ مراد آباد کی رہنے والی تھیں۔ بجز کانگریسی اور گاندھی جی کی زبردست بھکت۔ بتایا گیا کہ ایم ایل سی ہونے والی ہیں، جو وہ نہیں ہوئیں، ممکن ہے یہ بات کچھ اس قسم کی رہی ہوگی جیسے ایسے موقعوں پر کی جاتی ہیں اور اکثر صورتوں میں جھوٹی ہوتی ہیں۔ حیات اللہ انصاری کے نظر باغ کے مکان میں داخل ہوتے وقت بھی مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ 'تجویز' کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ میں گاندھی جی کی عظمت کا تو قائل تھا، کسی ماڈرن گاندھی وادی کے ماتحت کام بھی کر سکتا تھا لیکن کسی کھدر پوش گاندھی وادی خاتون کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی میرے لئے محال تھا۔ چنانچہ آغاز ہی حرفِ اختلاف سے ہوا۔ انہوں نے عدم تشدد کا راگ الاپا تو میں نے طبقاتی جدوجہد کا، اور سلطانہ حیات کی صورت ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم والی ہوگئی۔ بات بننے کے بجائے بگڑتی جارہی تھی۔ آخر انہوں نے ایک صورت نکالی، بولیں: 'آج تو تمہارا آف ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھنؤ کا زو نہیں دیکھا ہے، ذکر بھی کر رہی تھیں۔ ایسا کرو تم انہیں لے جا کر زو دکھلاؤ۔'

'لیکن سلطانہ آپا' میں نے گویا مذاق میں کہا، 'اور زو کے جانور ہمیں دیکھنے کے لئے اپنے اپنے کٹہروں سے نکل پڑے تو کیا ہوگا؟'

میری بات سن کر سلطانہ آپا برا سا منھ بنا کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں لیکن ظاہر انہوں نے یہی کیا جیسے انہیں کوئی کام یکایک یاد آ گیا ہو۔ اب اکھاڑے میں صرف دو پہلوان تھے اور کشتی اس حد تک غیر دلچسپ ہوگئی تھی کہ دونوں نے نہایت سنجیدگی سے گاندھی واد کے بارے میں بات چیت شروع کر دی۔ اردو، اہنسا، دھرم، عدم تشدد کی اخلاقیات اور مذہب کی جانب گاندھی جی کے رویے سے ہوتے ہوئے بحث اس قدر نازک موڑ پر پہنچ گئی کہ میں نے یکایک پوچھ لیا:

'اچھا یہ بتائیے کہ گاندھی جی جنت میں جائیں گے یا دوزخ میں؟'

یہ ایک بہت مشکل سوال تھا۔ وہ بی بی اس قدر مذہبی اور پنج وقتہ نمازی تھیں کہ گاندھی جی کو جنت میں بھیج نہیں سکتی تھیں کہ وہ کلمہ گو تو تھے نہیں اور گاندھی جی اور دوزخ، آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ پھر میں نے ہر فیصلہ اس سوال کے اطمینان بخش جواب پر چھوڑ دیا اور ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے۔

ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں

ایک دن حیات اللہ انصاری اپنے کمرے میں بظاہر بالکل بیکار بیٹھے تھے یعنی کوئی کام کرتے ہوئے نظر نہ آ رہے تھے۔ اتنے میں اماشنکر دیکشت کا چپراسی آیا، اس پیغام کے ساتھ کہ صاحب نے سلام کہا ہے۔ جواب ملا کہ دو ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں۔ یہی دوسرے دن بھی ہوا اور پھر تیسرے دن بھی۔ دیکشت جی سمجھ گئے، خود ہی آئے اور ہنستے ہوئے بولے۔

'دہلی سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کو راجیہ سبھا کی رکنیت پر کوئی اعتراض تو نہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ابھی سے موضوع گفتگو بنے اور اب تو کاغذات بھی آ گئے ہیں۔ دستخط کر دیجئے۔'

انہوں نے شیروانی سے کاغذات نکال کر حیات اللہ انصاری کی طرف بڑھا دئے جس پر انہوں نے فوراً دستخط کر دئے اور یہ بھی نہیں دیکھا کہ راجیہ سبھا کی ممبری کے نامزدگی کے کاغذات ہیں یا قتل کے ملزم کا اقبالی بیان۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے شعبۂ ادارت کے کسی رکن کی کبھی سرزنش کی ہو لیکن وہ تعریف ضرور کرتے تھے اور ہمیشہ کاغذ کے چھوٹے سے پرزے پر۔ میرے پاس اس طرح کے تین دو سطری پرچے تھے لیکن اب صرف ایک رہ گیا ہے۔

۱۳/اگست ۱۹۵۹ء کے خط میں وہ لکھتے ہیں:

عابد سہیل صاحب

اخبار آپ نے اچھا نکال دیا۔ سرخیاں خوب ہیں اور حلقوں کی سرخیاں تو بہت ہی خوب۔

حیات اللہ

۱۳/اگست ۱۹۵۹ء

حلقوں کی سرخیوں کے ذکر پر خیال ہوتا ہے کہ ان دنوں روس اور امریکا کی سرد جنگ، گرم جنگ کے دہانے پر پہنچ گئی تھی اور ہر وقت ڈر لگا رہتا تھا کہ تیسری عالمی جنگ معلوم نہیں کس وقت پھوٹ پڑے۔ انہی دنوں جاپان کی لڑکیوں نے اپنے بالوں کی ایک ایک لٹ تراش کر دونوں ملکوں کے سربراہان حکومت کو بھیجتے ہوئے ان سے امن قائم رکھنے کی اپیل کی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ خبر حلقہ میں صفحۂ اول پر اسی سرخی کے ساتھ دی تھی:

'ہے کافی زلف کا سایہ ہی آشتی کے لئے'

ہوا یہ تھا کہ رات کی شفٹ میں محمد حسن قدوائی کی اتفاقی رخصت اور ایک سب ایڈیٹر کے یکا یک بیمار پڑ جانے سے میں تنہا رہ گیا تھا۔ میں نے حیات اللہ انصاری صاحب کو جو ان دنوں دفتر کے قریب ہی نظر باغ میں رہتے تھے، پرچہ بھیجا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ انہوں نے جواب میں لکھا، 'میں جانتا ہوں آپ اکیلے اخبار نکال سکتے ہیں۔' میں سمجھتا تھا کہ پرچہ ملتے ہی وہ بھاگے بھاگے چلے آئیں گے۔ عشرت صاحب ہوتے تو ایک منٹ تاخیر نہ کرتے۔ جب یہ خواب دیکھ کر کہ قومی آواز میں آگ لگ گئی ہے، وہ رات میں چار بجے چلے آئے تو ایک نوسکھیا کے ہاتھ میں ایڈیشن کی باگ ڈور سونپنے کے بجائے وہ اپنی نیند ضرور غارت کر دیتے۔ میرا خیال ہے کہ عشرت صاحب ان دنوں لمبی چھٹی پر تھے ورنہ حیات اللہ انصاری کو پرچہ بھیجنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ حیات اللہ انصاری نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ آپ اکیلے اخبار نکال سکتے ہیں لیکن وہ ہر گھنٹے آدھے گھنٹے بعد 'نوجیون' کے دفتر میں فون کر کے سینئر کاتب خنداں لکھنوی کو بلاتے اور کام کی صورت حال دریافت کرتے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

محمد حسن قدوائی کے دفتر نہ آسکنے کی اطلاع بھی دلچسپ طریقہ سے ملی تھی۔ تقریباً ۹ بجے رات میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور کہا گیا، 'آج دولہا بھائی نہیں آئیں گے۔'

میں نے پوچھا، 'کون دولہا بھائی؟'

جواب ملا، 'محمد حسن قدوائی'

میں نے پوچھا، 'آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟'

جواب ملا، 'میں ان کا سالا بول رہا ہوں۔'

محمد حسن قدوائی کا یہ سالا خورشید کامل قدوائی تھا جو بعد میں یو این آئی (اردو) کا نیوز ایڈیٹر ہوا۔ افسوس وہ اب ہم میں نہیں۔ میں اسے یہ واقعہ اکثر یاد دلایا کرتا اور پھر ہم دونوں خوب ہنستے۔ ایک بار تو میں نے اس کی بیٹی نائلہ کو بھی سارا واقعہ سنایا تھا۔ وہ مسکرا کر رہ گئی تھی۔ اس وقت خورشید حیات تھے۔ ان کے انتقال کے بعد پہلی بار یہ واقعہ دہرا رہا ہوں۔ نائلہ کو یاد دلاؤں تو وہ رو دے گی۔ ہمت بھی نہیں کر سکتا۔ پہلی بار جب میں نے اسے یہ واقعہ سنایا تو وہ پائنیر میں صحافت سیکھ رہی تھی۔ یہ ۱۹۹۵ء یا اگلے سال کی بات ہے۔ میں اور ظفر جورڈن (افسوس اب جورڈن ہم میں نہیں) ان دنوں پائنیر سے متعلق تھے۔ قومی آواز کی ایک مشہور چیز جس کا ذکر شہر کے ادبی حلقوں میں بھی اکثر ہوتا۔ پہلی منزل پر قومی آواز کے سامنے کا چھجا تھا جس کی شہرت بطور 'غیبت محل' دور دور تھی۔ یہاں غیبت کے بجائے دل کی بھڑاس نکالی جاتی اور ہر اس شخص کی ٹانگ گھسیٹی جاتی جو وہاں موجود نہ ہوتا لیکن جو لوگ لذت آشنائے غیبت ہیں وہ جانتے ہیں کہ دل کی بھڑاس نکالتے وقت زبان و بیان پر قابو رکھنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ برسوں بعد ایک دن میں نے دلاور حسین صاحب سے جو ہیرالڈ میں میرے بزرگ دوست تھے 'غیبت محل' کا ذکر کیا، بہت ہنسے پھر ایک دن شکرو پان والے کی دکان سے واپس آتے ہوئے انہوں نے عمارت کے اس حصہ کی طرف دیکھا اور پوچھا، کیا نام بتایا تھا 'تبرّا محل' میں نے کہا 'تبرّا محل' نہیں 'غیبت محل' کہنے لگے، 'ایک ہی بات ہے۔'

دلاور حسین مذہب کے سخت پابند تھے لیکن کسی قسم کا تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ مدح صحابہ اور تبرّا ایجی ٹیشن کی رپورٹنگ انہوں نے ہی کی تھی اور پھر دونوں فریقوں نے اپنے اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے مقدمہ میں ان کی رپورٹ کے مختلف حصے عدالت میں پیش کئے تھے۔

نیشنل ہیرالڈ

کسی انگریزی اخبار سے متعلق ہونے کی بات میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی اور نہ میں خود کو اس کا اہل ہی سمجھتا۔ ہائی اسکول کے بعد کلاس روم میں اردو نہ پڑھنے کے باوجود خیال تھا کہ اردو صحافت میں اتنی اہلیت تو پیدا کر ہی لوں گا کہ لشتم پشتم زندگی گزار لوں۔ سچ پوچھئے تو میرے ذہن میں مستقبل کا کوئی نقشہ ہی نہ تھا لیکن قسمت نے کوئی نقشہ ضرور بنا رکھا تھا جو خاصہ ٹیڑھا میڑھا تھا اور شاید اس کے روشن ترین مقام کا نام تھا نیشنل ہیرالڈ۔ ایم اے کر کے پی ایچ ڈی Synopsis کی منظوری کے لئے کوشش کر رہا تھا کہ آل انڈیا ریڈیو پر ملک بھر کی یونیورسٹیوں کی ٹیموں کے درمیان مباحثوں کے مقابلہ کے لئے لکھنؤ یونیورسٹی کی ٹیم کی قیادت میرے سپرد ہوئی۔ اس ٹیم میں صدیق اشرف، عبد المنان اور آفتاب اختر شامل تھے۔ پہلا مقابلہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر بنارس یونیورسٹی کی ٹیم سے ہوا جس میں لکھنؤ یونیورسٹی سرخرو ہوئی۔ اس کے بعد کے مقابلے دہلی ریڈیو اسٹیشن پر ہوئے اور فائنل لکھنؤ اور غالباً بمبئی (اب ممبئی) یونیورسٹیوں کے درمیان ایک بڑے اسٹوڈیو میں منتخب حاضرین کی موجودگی میں ہوا۔ حاضرین میں نجم الحسن اور ان کے توسط سے بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جن کا کسی نہ کسی طرح لکھنؤ سے تعلق تھا۔ نتیجے کا اعلان ہوتے ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ کچھ لوگ تو کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ نجم الحسن ان میں پیش پیش تھے۔

اگلے دن قومی اخبار کے صفحہ اول کی خبر کی سرخی تھی Lucknow boys bag/Air award ہم چاروں دریا گنج میں نجم الحسن کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ یہ تو یاد نہیں کہ اس وقت گولچا سنیما تھا یا نہیں لیکن اب اسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ نجمل کا مکان اس کے تقریباً سامنے اپنے مرحوم دوست کے مکان کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ ان دنوں نجم الحسن کا پولینڈ کے سفارت خانے میں آنا جانا لگا رہتا۔ اتفاق سے ایک آدھ دن بعد پولینڈ کے قومی دن کے موقع پر اشوکا ہوٹل میں ایک پر تکلف عصرانہ دیا گیا۔ نجمل نے ہم لوگوں کے لئے بھی دعوت نامے حاصل کر لئے اور ہم سب اشوکا میں دو گاڑیوں میں گئے۔ ان میں سے ایک ٹیکسی تھی اور دوسری نجمل کے کسی دوست کی کار۔ اس وقت

دریا گنج سے اشوکا تک ٹیکسی کا کرایہ پانچ روپئے تھا۔عصرانے میں ایک سے ایک لوگ موجود تھے۔ سفارت کار، وزراء بڑے اخباروں کے نامی گرامی صحافی، ہندی، اردو اور انگریزی کے بڑے بڑے ادیب جن میں سے بیشتر سے میں واقف نہ تھا۔

انگور کی بیٹی سے میرا تعارف اسی ہوٹ میں ہوا اور چونکہ یہ پہلا تجربہ تھا اس لئے حلق سے دماغ تک پہنچنے میں اسے دیر نہ لگی۔ اسی حالت میں مجھے اشوکا کے وسیع وعریض ہال کا ایک ستون دوسرے ستونوں سے کچھ زیادہ چوڑا نظر آیا اور میں نے پاس جاکر دیکھا تو پتہ چلا ایم سی اس سے ٹیک لگائے کھڑے ہیں۔ گلاس ان کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہاCongratulations، ایم سی کی آواز ایسی تھی کہ آسان سے آسان لفظ بھی مشکل ہی سے سمجھ میں آتا لیکن اس وقت سیاق وسباق نے مشکل آسان کر دی اور میں نے کہا، Thanks You، گلاس میں پہلے ہی میز پر رکھ چکا تھا لیکن یہ خیال ضرور تھا کہ ہوسکتا ہے انہوں نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا ہو۔ یہ سوچ کر کچھ کچھ ڈر لگ رہا تھا لیکن ایک بات پر حیرت بھی تھی کہ ہمیشہ تو وہ لوگوں میں گھرے رہتے تھے، اس وقت تنہا کیوں کھڑے ہیں۔لکھنؤ میں ان کے بیشتر دوست کمیونسٹ یا ایسے دانشور تھے جو کمیونسٹ پارٹی کے قریب تھے۔خود ان کا شمار ترقی پسندوں میں ہوتا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ اس وقت صورت اتنی مختلف کیوں ہے۔

اسی وقت دماغ میں ایک کوندا لپکا کہ ان کو نظرانداز کرنے کی کوشش شاید اس لئے کی جارہی ہے کہ انہوں نے کیرالا کی کمیونسٹ حکومت کے خلاف چرچ کی تحریک کی پرزور حمایت کی تھی۔ کمیونسٹوں کو ان سے یہ امید نہ تھی۔ وہ انہیں اپنا سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہیں تکلیف بھی زیادہ ہوئی اور ان کا ردِعمل بھی سخت تھا۔ان دنوں یہ بات مشہور تھی کہ نمبودری پد حکومت کو برطرف کرنے کے سلسلے میں پنڈت نہرو کچھ ایسے پرجوش نہ تھے لیکن کابینہ کی میٹنگ میں نیشنل ہیرالڈ کے اداریئے کا تراشہ دکھاتے ہوئے وزیر داخلہ گووند ولبھ پنت نے جب کہا کہ 'ہوسکتا ہے آپ میری بات کو ایک رجعت پسند بڈھے کی بکواس سمجھیں، لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ یہ نوجوان کیا کہہ رہا ہے' تو پنڈت جی خاموش ہو گئے۔ پنڈت نہرو کے تذبذب کا ایک سبب تو یہ تھا کہ بنگال اس وقت کے صوبۂ مدراس، مشرقی اتر پردیش اور متعدد دوسرے علاقوں میں کمیونسٹ پارٹی کی مقبولیت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور دوسرا سبب تھا ان کا ماضی جس کے وہ سارے لوگ جو قدامت پسندی کی یلغار میں ان کے شانہ بشانہ کھڑے تھے، آج ان کے سامنے سینہ سپر تھے۔ کچھ ویسی ہی صورت تھی جیسی ۱۹۴۲ء میں پیش آئی تھی جب کانگریس میں اس وقت کے ان کے دست و بازو ڈاکٹر زیڈ احمد، ڈاکٹر مظفر احمد، نمبودری پد، ڈاکٹر علیم اور ڈاکٹر ادھیکاری وغیرہ ان سے جرأت انکار کے متقاضی تھے۔ پنڈت نہرو نے کانگریس کے اس فیصلہ کو قوم پرستی کے ہاتھوں بین الاقوامیت کی شکست قرار دے کر اپنی پریشانی کا اظہار تو کیا لیکن اس جذباتی فیصلے کی مخالفت نہ کر سکے جس سے آخر کار قوم پرستی کو فرقہ پرستی کی چادر اوڑھ لینے میں مدد ملی۔

ایسا ہی کچھ اس بار بھی ہوا اور یہ آزاد ہندوستان میں وسیع النظری پر تنگ نظری کی سب سے بڑی فتح ثابت ہوئی۔ اس فتح نے برطانیہ کی طرح دو جماعتی سیاسی نظام کے تصور کو تقویت بخشی۔ ہندوستان میں عملی طور سے اس کا مطلب تھا ایک بائیں اور دائیں بازو کے درمیان کی پارٹی (سینٹرسٹ) اور دوسری سراسر رجعت پسند پارٹی۔ میں رَو میں بہت آگے نکل گیا جب کہ کہنا صرف یہ تھا کہ ایم سی کے الگ تھلگ پڑ جانے کا سبب نمبودری پد حکومت کی جانب ان کا رویہ تھا۔

دو چار دن دہلی میں گزار کر لکھنؤ واپس آیا اور دفتر گیا تو عشرت صاحب نے کہا، 'ایم سی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔' جان ہی تو نکل گئی۔ خیال ہوا کہ انہوں نے ضرور میرے ہاتھ میں گلاس دیکھ لیا ہوگا۔ اب ڈانٹ پڑے گی۔ ساتھ ہی یہ ڈر بھی لگ رہا تھا کہ ان کی بات سمجھ میں نہ آئی تو کیا ہوگا۔ایم سی تک رسائی خاص مشکل سے ہوئی۔ ان کے سکریٹری گلاب رائے سریواستو کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ انہیں قومی آواز کے ایک جونیئر سب ایڈیٹر سے کیا کام ہوسکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن میرے اصرار پر وہ ان سے تصدیق کے لئے گئے تو منھ لٹکائے ہوئے واپس آئے اور مجھے ان کے کمرے میں پہنچا کر لوٹ گئے۔ایم سی کے پہلے جملے نے مجھے حیران کر دیا۔ انہوں نے انگریزی میں پوچھا، 'کیا تم ہمارے ساتھ کام کرنا پسند کروگے؟'

شاید اس سوال سے حوصلہ پا کر ہی میں نے اپنے سیاسی خیالات کے سلسلہ میں ان کے سوال کے جواب میں صاف صاف الفاظ میں انہیں بتا دیا تھا کہ میں کمیونسٹ تحریکوں میں سرگرم رہا ہوں۔ میں نے تو جوش جہاد میں ان سے یہ تک کہہ دیا کہ میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہوں۔سچ پوچھئے تو کیرالا کے مسئلے پر نیشنل ہیرالڈ کے روئے سے میں دل ہی دل میں ان سے ناراض بھی تھا۔انہوں نے بی اے اور ایم اے میں میرے مضامین کے علاوہ یہ بھی پوچھا کہ امتحان میں سوالات کے جوابات ہندی میں دئے تھے یا انگریزی میں اور دو چار دوسری باتیں دریافت کرنے کے بعد یکا یک Now you may go کہہ کر مجھے حیرت میں ڈال دیا۔

لیکن جب تین چار دن بعد ایسوسی ایشن جرنلس کے مینجنگ ڈائرکٹر اما شنکر دیکشت نے مجھے بلا کر کہا کہ تمہاری ملازمت قومی آواز سے نیشنل ہیرالڈ منتقل کی جارہی ہے تو میں خوش بھی تھا، حیران بھی اور

پریشان بھی کیونکہ مجھے اپنی انگریزی کے بارے میں کوئی خاص خوش فہمی نہ تھی اور انگریزی صحافت سے بالکل ہی ناواقف تھا۔ خوشی کا سبب تو ظاہر ہے۔ اس وقت مجھے حیات اللہ انصاری کے ایک فیصلے سے بڑی مدد ملی۔ انہوں نے دیکشت جی کو لکھا کہ قومی آواز سے میری منتقلی چھ ماہ بعد ہی ممکن ہو سکے گی کیونکہ اس دوران کسی نئے شخص کی تقرری کے بعد اسے تربیت بھی دینی پڑے گی۔ اس وقت تو اس فیصلے سے میری خوشیوں پر اوس پڑ گئی تھی لیکن انگریزی صحافت میں مجھے جو تھوڑی بہت کامیابی ملی اس کی بنیاد انہی چھ مہینوں میں پڑی۔ میں نے ایم سی کی اجازت سے قومی آواز میں اپنی پوری ڈیوٹی کرنے کے علاوہ نیشنل ہیرالڈ میں کام سیکھنا شروع کر دیا۔ پہلے ہی دن معاملہ مسٹر کرپلانی سے ہوا جو چیف سب ایڈیٹر تھے۔ وہ اچاریہ کرپلانی کے رشتہ دار تھے۔ انہوں نے ایسی دس بیس خبریں جو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتیں، مجھے سب کرنے کیلئے دیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان کا کیا کروں کیونکہ کام مجھے بالکل نہ آتا تھا۔ میں نے کرپلانی سے پوچھا کہ ان کا کیا کروں تو انہوں نے جھنجھلاتے ہوئے خود سے کہا، 'ایسے آدمی کو کیا کام سکھایا جائے جو جانتا ہی نہیں کہ اسے سیکھنا کیا ہے۔' مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کی آواز اتفاق سے بلند ہو گئی تھی یا ارادتاً لیکن مجھے ان کی یہ بات اس قدر بری لگی کہ میں نے کسی قدر خفگی سے ساتھ اونچی آواز میں کہا، 'یہ بات تو آپ کو ایم سی سے پوچھنی چاہئے۔'

انہوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا، پھر اپنا کام کرنے لگے۔ کیا کرتا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ اے کے ورما نیشنل ہیرالڈ کی گھوڑے کی نال کی شکل کی میز میرے پاس بیٹھے تھے۔ انہیں میرے حال پر رحم آیا اور انہوں نے بتایا کہ پیراگراف کا نشان '¶' ہے۔ جس حرف کو کیپٹل کے طور پر لکھنا ہو اس کے نیچے ایک چھوٹی سی لکیر کھینچ دی جاتی ہے۔ ٹیلی پرنٹر کی خبروں میں الفاظ کبھی کبھی دوبارہ ٹائپ ہو جاتے ہیں، انہیں کاٹ دیا جاتا ہے اور گرامر اور اسپیلنگ پر توجہ دینی ضروری ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان چھوٹی خبروں پر سنگل کالم کی سرخیاں لگانی ہوں گی۔ یہ ابتدائی باتیں بتا کر انہوں نے وہ لمبی سی دفتی جس پر سرخی کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے ٹائپ کے نمونے اور دو کالمہ سرخی میں ان حروف کی تعداد دی ہوئی تھی، میری طرف بڑھا دی۔

میری ایک اور دقت یہ تھی کہ گرامر بالکل نہ آتی (اب بھی نہیں آتی) اور اسپیلنگ میں بیحد کمزور تھا (اب بھی ہوں) خیر، میں نے یہ چھوٹی چھوٹی خبریں نہایت توجہ سے سب کرنا شروع کیں اور اپنا کام مکمل کرنے کے بعد کرپلانی کی طرف بڑھا دیں۔ انہوں نے اسی طرح کی دوسری خبریں مجھے دیتے ہوئے کہا، 'ایڈیشن ریلیز کرنے کے بعد انہیں دیکھوں گا۔'

اس وقت بھی ان کی آواز میں کرختگی برقرار تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید ان کی آواز ہی ایسی ہے لیکن بعد کے ایک واقعہ سے پتہ چلا کہ معاملہ صرف آواز کا نہ تھا۔

اس طرح میں انگریزی صحافت کے ابتدائی اسباق دھیرے دھیرے سیکھتا رہا اور جس دن میری 'سب' کی ہوئی ایک نہایت مختصر سی خبر اندر کے کسی صفحے پر شائع ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ اس دن کا اخبار میرے لئے ہی شائع ہوا ہے۔ اس خبر کی سرخی تھی:

Labour whip on Insurance Bill

کرپلانی مجھے آپ کہہ کر مخاطب کرتے تھے جب کہ میں عمر میں ان سے بہت چھوٹا تھا۔ ایک دن میں نے نرم سا احتجاج کیا تو انہوں نے کہا، In fact آپ تو ہر ایک کو کہنا چاہئے۔ لیکن وہ مجھے 'آپ' اور دوسروں کو 'تم' سے یا نام سے مخاطب کرتے رہے اور اس طرح انہوں نے غیریت کا پردہ جو کچھ ایسا باریک بھی نہ تھا، پڑا ہی رہنے دیا۔ کرپلانی کے ایک مخصوص رویہ کا میں نے اشارتاً ذکر تو کر دیا لیکن مجھے اس بارے میں ان سے کوئی شکایت نہیں۔ کسی کو میرے بالکل دوسرے قسم کے رویئے کے بارے میں بھی تو شکایت ہو سکتی تھی۔ ایک بار دہلی اردو اکادمی کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے دیویندر اِسّر نے میری موجودگی میں کہا تھا،

'سہیل میرے بارے میں کہتے ہیں کہ اِسّر آدمی تو اچھا ہے لیکن کمیونسٹ مخالف ہے۔'

خیر یہ تو ایک مذاق تھا۔

کرپلانی سب ایڈیٹر بہت اچھے تھے۔ ان کے کام کی رفتار بہت سست تھی اور وہ آٹھ کالمہ سرخی تک حروف گنے بغیر لگا دیتے تھے۔ ایم سی ان کے کام سے بہت خوش تھے اور انہیں یقین تھا کہ ان کے ذاتی خیالات کچھ بھی ہوں وہ اخبار کی پالیسی پر ہمیشہ عمل کریں گے اور انہوں نے ہمیشہ کیا بھی یہی۔ ان کی سرخی خبر سے چپک کے رہ جاتی تھی۔ میں نے سرخی لگانا ان سے اور 'سبنگ' اپچ کے گوڑ سے سیکھی۔ اب اسے اتفاق ہی کہئے کہ دونوں ہی میرے نظریات کے داہنی جانب تھے، ایک زیادہ دوسرا کم۔ صحافت سے رشتہ توڑنے کے بعد کرپلانی آر۔ ایس۔ ایس۔ کے صدر دفتر میں کسی کلیدی عہدے پر چلے گئے جب کہ اپچ کے گوڑ نے قوم پرستی اور Democratic Socialism کا پردہ ہمیشہ ڈالے رکھا۔

ہیرالڈ میں اضلاع کے نمائندوں کی کاپی 'سب' کرنا ایک مشکل مرحلہ ہوتا کیونکہ ایم سی اصرار کرتے کہ یہ کاپی دوبارہ لکھنے کے بجائے صرف 'سب' کی جائے تاکہ ہر خبر کی زبان کا اپنا ذائقہ باقی رہ جائے۔ مسٹر لوتھر کی تقرری سے پہلے یہ کام سارے ہی جونیئر سب ایڈیٹروں کو کرنا پڑتا۔ سب جان بچاتے میں بھی بچا تا لیکن کابل جانا ہے تو کوہان سے سابقہ پڑے گا ہی۔ ایسے مواقع پر قومی آواز کی محنت کی عادت ساتھ دیتی۔ اسی نے ترقی کے راستے کھولے لیکن دشمن بھی پیدا کئے۔

□□□

عابد سہیل کی خاکہ نگاری

پروفیسر شارب ردولوی
سی-۹۵، سیکٹر ای، علی گنج، لکھنؤ
موبائل: 8840038282

عابد سہیل لکھنؤ کی ادبی تاریخ کے ایک ایسے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جسے فکشن کا عہد کہا جا سکتا ہے۔ جس میں ایک طرف علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، شوکت صدیقی، ڈاکٹر احسن فاروقی، رضیہ سجاد ظہیر، مائل ملیح آبادی، رام لعل اور روائت سے وابستہ لوگوں میں نسیم انہونوی، خان محبوب طرزی، وحشی محمود آبادی، دوسری طرف نئی نسل کے قلم کار قاضی عبدالستار، عابد سہیل، اقبال مجید، رتن سنگھ، منظر سلیم، آغا سہیل، عائشہ صدیقی اور شمیم نکہت وغیرہ تھیں۔ شاید ہی ملک کے کسی شہر نے ایک وقت میں اتنے اور ایسے افسانہ نگار دیئے ہوں گے جنھوں نے اس راہ میں اپنے قدم کے نشان چھوڑے ہوں۔ عابد سہیل نے فکشن کی دنیا میں اپنے افسانوں سے ایک منفرد جگہ بنائی لیکن افسانہ نگاری سے الگ ان کی ایک حیثیت خاکہ نگار، خودنوشت نگار، فکشن ناقد اور مترجم کی بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں کردار نگاری پر بڑی دست رس حاصل تھی۔ وہ تھے تو فلسفہ کے طالب علم لیکن انسانی نفسیات کا مطالعہ ان کا بہت اچھا تھا، اس لیے ان کے کردار کہانی سے باہر چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی یہی صفت انھیں خاکہ نگاری کی طرف لائی۔

خاکہ در اصل ایک کرداری افسانہ ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کردار سے ایک عہد کے لوگ ذاتی طور پر واقف ہیں۔ اس لیے خاکہ نگار اس کے بارے میں اپنی مرضی سے جو چاہے وہ نہیں لکھ سکتا۔ یہی سبب ہے افسانہ نگاری کے مقابلے میں خاکہ نگاری مشکل کام ہے کہ آپ کسی زندہ یا جاننے والے شخص کے بارے میں اس طرح لکھیں کہ اس کے بارے میں لوگوں کے ذہن میں پہلے سے بنا ہوا خاکہ مجروح بھی نہ ہو اور خود لکھنے والے کے ذہن میں جو اس کی تصویر ہے وہ اپنے نقوش کے ساتھ بن بھی جائے۔ یہ ایک مشکل کام ہے، اس لیے کہ کسی بھی مشہور شخصیت کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہو سکتے ہیں۔ انسان کی پسند و ناپسند کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں، اس لیے خاکہ نگار کو شخصیت کے ہر پہلو پر نظر رکھ کر قلم اٹھانا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی کردار کی خامیوں کی پردہ پوشی بھی نہیں کر سکتا اور اسے بیان کر کے اپنی منتخب شخصیت کی کردار کشی بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ایسے موقعوں پر اسے زبان اور اسلوب کا سہارا لینا پڑتا ہے کہ کچھ نہ کہنے کے باوجود سمجھنے والے سمجھ لیں۔ عابد سہیل کو یہ ہنر خوب آتا تھا، نثر تو ان کی اچھی تھی ہی، وہ اسے Twist دینا بھی جانتے تھے، اس لیے ایسے موقعوں پر بچ کر نکل جاتے تھے۔

عابد سہیل کے خاکوں کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ ان کا خاکوں کا پہلا مجموعہ کھلی کتاب 2004 میں شائع ہوا جس میں 15 خاکے ہیں اور پورے آدھے ادھورے 2015 میں یعنی اس کی اشاعت کے پورے 11 سال بعد، اس میں 25 خاکے ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں ایک ایک خاکہ غیر ذی روح ''شخصیت'' پر ہے۔ کھلی کتاب میں اولڈ انڈیا کافی ہاؤس اور 'پورے آدھے ادھورے' میں ماہنامہ کتاب پر۔۔ غیر ذی روح کی تجسیم تو ممکن ہے لیکن اسے اپنے عہد کا ایک اہم کردار بنا کر پیش کرنا مشکل کام ہے لیکن عابد سہیل نے اس خوبی سے یہ خاکے لکھے ہیں کہ آج بالکل بدلے ہوئے کافی ہاؤس میں نگاہیں ان گوشوں، ان میزوں پر، ان ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور سیاست دانوں کو تلاش کرتی ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ ان کے خاکوں کے کرداروں میں سے زیادہ تر سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ اس لیے لکھنؤ کے جس زمانے کا ذکر ان خاکوں میں ہے، اس زمانے میں میں بھی لکھنؤ ہی میں تھا، سوائے اس کے بعض Development کا میں عینی شاہد نہیں ہوں اس لئے کہ میں 1961 میں دہلی چلا گیا تھا اور یہاں صرف تعطیلات یا ادبی تقریبات میں آنا جانا رہا۔ کھلی کتاب کا پہلا خاکہ علیم صاحب (ڈاکٹر عبدالعلیم) کا ہے اور آخری خاکہ اولڈ انڈیا کافی ہاؤس پر ہے۔ ان دونوں سے عابد سہیل کا بہت گہرا رشتہ رہا ہے اور یوں بھی علیم صاحب کا ذکر ہو اور اولڈ انڈیا کافی ہاؤس کا ذکر نہ ہو یا کافی ہاؤس کا ذکر ہو اور علیم صاحب کا ذکر نہ آئے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بھی پہلے اور آخری میں خاکے کو گفتگو کے لیے منتخب کیا کہ ان دو کے ذکر میں پورے لکھنؤ کا ذکر آجاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کی شخصیت علم کا ایک ستون تھی۔ اس عہد میں علماء اور دانشور تو کئی تھے لیکن علیم صاحب عالم، خاموش طبع، سنجیدہ، کم سخن لیکن خوش مزاج تھے۔ عابد سہیل کے وہ رشتے میں ماموں تھے اور عابد سہیل ان کی شخصیت اور

علم سے بہت متاثر تھے، شاید انھیں کے اثر کے تحت عابد سہیل نے بھی سگار پینا شروع کیا جسے بہت مجبوری میں آخر عمر میں انھوں نے ترک کیا۔ علیم صاحب کا تعارف بھی انھوں نے سگار سے ہی کرایا ہے۔

''.... دہرا بدن، گورا چٹا رنگ، ذرا سی خوشی یا ناگواری میں کان کی لووں تک سرخ ہوجانے والا چہرہ، فرنچ کٹ داڑھی، شیروانی، چوڑی مُہری کا پیجامہ اور سگار۔

اور سگار تو علیم صاحب کی پہچان بن گیا

ایک صاحب نے پوچھا آپ دن میں کتنے سگار پی لیتے ہوں گے

تین یا چار

لیکن میں نے تو جب بھی آپ کو دیکھا سگار پیتے دیکھا

آپ کو دیکھ کر جلا لیتا ہوں، علیم صاحب نے مختصراً جواب دیا اور محفل قہقہہ زار بن گئی''

(کھلی کتاب ص 14)

علیم صاحب کا یہ خاکہ عابد سہیل کے بہت سے خاکوں پر بھاری ہے۔ اس میں جس کامیابی کے ساتھ اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں اور علیم صاحب کے مختصر جوابات سے ان کی علمیت اور ذہانت کو عابد سہیل نے نمایاں کیا ہے اس سے علیم صاحب کا پورا کردار سامنے آجاتا ہے۔ علیم صاحب جتنے بڑے عالم تھے، اتنے ہی اپنے معاملات سے بے نیاز تھے، اس کا مجھے ذاتی اندازہ بھی ہے۔ علیم صاحب وزارت تعلیم کے ایڈوائزر اور ترقی اردو بورڈ کے وائس چیئرمین تھے۔ پروٹوکول میں ان کا عہدہ مرکزی نائب وزیر کا تھا۔ میں ان دنوں ترقی اردو بورڈ میں p.p.o اور ہیڈ آف دی آفس کے عہدہ پر تھا۔ روز صبح سے شام تک میرا ان کا ساتھ رہتا تھا۔ ایک بار میں ان کی مدت کار ختم کے قریب تھی تو میں نے بہت خاموشی سے ان سے کہا کہ آپ ایک بار نورالحسن صاحب (جو اس وقت وزیر تعلیم تھے) سے مل لیجئے، پوچھا کیوں-- میں نے کہا توسیع کے لیے۔ کوئی جواب نہ پا کر میں نے کہا آپ اجازت دیں تو میں چلا جاؤں-- جواب ملا، ضرورت نہیں ہے۔ عابد سہیل نے اس طرح کا ایک واقعہ ان کی وائس چانسلرشپ کے سلسلہ میں لکھا ہے جس سے علیم صاحب کے کردار کی بلندی اور علمی وقار کا اندازہ ہوتا ہے۔ عابد سہیل لکھتے ہیں:

''یونیورسٹی کورٹ نے وائس چانسلرشپ کے لئے تین نام بھیجے ہیں، علیم صاحب کا نام تیسرا ہے۔

دہلی میں گھوڑے دوڑ رہے ہیں، علیم صاحب علی گڑھ میں ہیں

وائس چانسلرشپ کا فیصلہ ہونے والا ہے

علیم صاحب علی گڑھ میں ہیں

کوئی مشورہ دیتا ہے، ''ارے دہلی جایئے بات کیجئے''

''کیا بات کروں، کہوں مجھے وائس چانسلر بنا دیجئے۔''

(کھلی کتاب ص 16)

> کھلی کتاب میں یوں تو بہت سے اہم لوگوں کے خاکے ہیں جن میں قومی آواز کے ایڈیٹر مشہور افسانہ نگار اور اردو کے ضخیم ترین ناول لہو کے پھول کے مصنف حیات اللہ انصاری اور نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر چلپت راؤ جو عرف عام میں چیلا پتی راؤ کے نام سے مشہور تھے۔ ہندوستانی صحافت کے اس وقت کے سب سے اہم اشخاص تھے۔ ان دونوں حضرات سے عابد سہیل بیحد متاثر بھی تھے اور قریب بھی، اس لئے وہ اپنے اسلوب کو سنبھال نہیں سکے۔ اور ان خاکوں پر مضمون کا گمان ہوتا ہے۔

علیم صاحب ایک شفیق استاد تھے اور مختلف زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں، شاید ہی ہندوستان میں کوئی دوسرا ایسا شخص ہو جو ایک وقت میں اتنی زبانوں سے واقف ہو۔ عابد سہیل لکھتے ہیں۔

''علیم صاحب کتنی زبانوں پر حاوی تھے، یہ راز کبھی کھل نہ سکا۔ سنسکرت کی انہیں شدبد تھی، ہندی وہ جانتے تھے، انگریزی، اردو، جرمن، فارسی، فرنچ، چینی، عربی اور روسی زبان پر ان کی قدرت کا عام طور پر لوگوں کو علم تھا۔ علی گڑھ میں تاجکستان کے ایک وفد کے اعزاز میں ایک بڑا جلسہ ہوا جسکی صدارت علیم صاحب نے کی۔ خاتون مترجم کو وفد کے ایک رکن کی تقریر کا ترجمہ کرنے میں دقت ہوئی تو علیم صاحب نے انگلی پکڑ کر اسے بٹھا دیا اور خود کھڑے ہوگئے۔ اس دن لوگوں کو معلوم ہوا کہ علیم صاحب تاجک بھی جانتے ہیں۔''

(کھلی کتاب ص 18)

خاکے کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ہم جس کو جانتے ہیں اس کی شناخت کرسکیں اور جسے نہیں جانتے ہیں اس کی شخصیت کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بنا سکیں اور اسے دیکھ سکیں۔ عابد سہیل کے اس مجموعے کا آخری خاکہ 'اولڈ انڈیا کافی ہاؤس' ہے۔ ان کے تمام خاکوں پر گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں ہے لیکن کافی ہاؤس لکھنؤ کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے اور شاید اسی طرح جس طرح پیرس کے ادیبوں، دانشوروں اور آرٹسٹوں کی زندگی کے لیے Le Cafe de Flore تھا جہاں ژاں پال سارتر بیٹھا کرتے تھے، جو پیرس کا سب سے پرانا کافی ہاؤس تھا۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ کا اولڈ انڈیا کافی ہاؤس بھی یہاں کا سب سے قدیم کافی ہاؤس اور دانشوروں کا اڈا تھا۔ یہ کافی ہاؤس ہر چھوٹے بڑے کو یکساں طور پر عزیز تھا۔ نوجوان یہاں علم و ادب اور

سلیقۂ گفتگو سیکھنے آتے تھے۔ مدیران اور سیاست دانوں کے لئے بحث ومباحثہ کا مرکز تھا، لوگوں کو کافی کا اتنا نشہ نہیں تھا جتنی یہاں کی گفتگو کا تھا۔ بارش ہو یا طوفان آئے، شام کو اولڈ انڈیا کافی ہاؤس پہنچنا ضروری تھا۔ عابد سہیل کافی ہاؤس میں مستقل آنے والوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

''معلوم نہیں کافی ہاؤس میں ایسی کیا خوبی تھی کہ ہر پڑھا لکھا شخص یا ہر وہ شخص جو خود کو پڑھا لکھا ظاہر کرنا چاہتا تھا یا سمجھتا تھا وہاں ضرور آتا تھا۔ بید کی چوڑی چوڑی کرسیاں، دیواریں ایسی کہ جن پر دو سال سے رنگ و روغن نہ ہوا ہو، بیروں کے لباس تو وہی جو عام طور پر دوسرے ہوٹلوں میں نظر آتے ہیں، پگڑی پر لال کلغی بھی ہوتی تھی لیکن نہ پیچ وخم استوار ہوتے اور نہ ان بیروں کے چہروں پر وہ جھوٹی مسکراہٹیں ہوتیں جو بڑے ہوٹلوں کے بیروں کے چہروں پر نظر آتی ہیں اور نہ آرڈر لیتے وقت سر کر جنبش دیتے اور نہ مسکراہٹ اس طرح بکھیرتے جیسے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ بس ساری زندگی سے اس کا انتظار کرتے رہے ہوں مگر دو باتیں ضرور تھیں۔ ایک تو یہ کہ ایک میز کی آواز دوسری میز پر سنائی نہیں دیتی تھی۔ دوسرے یہ کہ منیجر کے کاؤنٹر پر Right of admission reserved کی چھوٹی سی تختی کے عدم استعمال کے باوجود ایسوں ویسوں کو اندر آنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔'' (کھلی کتاب، ص196)

یہ تھا کافی ہاؤس کا نقشہ، یہاں میزیں اور کرسیاں خواہ کتنی پرانی ہوں، دیواریں کیسی ہی کیوں نہ ہوں لیکن یہاں بیٹھنے والے دنیا کی سیاست اور دنیا کے ادب پر نگاہ رکھنے والی نام آور شخصیات تھیں۔ یہاں رام منوہر لوہیا، کے ڈی مالویہ، ڈی پی مکھرجی، عبدالعلیم، یشپال، بھگوتی چرن ورما، مجاز جیسے لوگ یہاں کے بیٹھنے والوں میں تھے۔

عابد سہیل لکھتے ہیں کہ

''یہ کرسیاں، یہ میز اور کافی ہاؤس کا یہ کونا عالمی سیاست اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی کیسی کیسی کہانیوں، کیسے کیسے تاریخ ساز فیصلوں کا خاموش گواہ ہے اس کا علم تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب انہیں زبان مل جائے..... یہاں ادب کے مسائل بھی زیر بحث آتے، یشپال، بھگوتی چرن ورما اور حیات اللہ انصاری کے ناولوں اور افسانوں اور مجاز کی نظموں اور غزلوں کے بھی تذکرے ہوتے''..... کاؤنٹر کے پاس یا ہال کے درمیان والے کھمبے سے ملحق میز پر شوکت صدیقی، منظر سلیم، کمال احمد صدیقی، کے این کٹر، سداسرن مسرا، سلام مچھلی شہری اور نووارد انِ بساط ہوائے دل میں مجید پرویز، بی این کاچر، عثمان غنی اور غوث انصاری بھی کبھی کبھی نظر آتے۔

(کھلی کتاب ص 19)

کھلی کتاب میں یوں تو بہت سے اہم لوگوں کے خاکے ہیں جن میں قومی آواز کے ایڈیٹر مشہور افسانہ نگار اور اردو کے ضخیم ترین ناول لہو کے پھول کے مصنف حیات اللہ انصاری اور نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر چلپت راؤ جو عرف عام میں چیلا پتی راؤ کے نام سے مشہور تھے۔ ہندوستانی صحافت کے اس وقت کے سب سے اہم اشخاص تھے۔ ان دونوں حضرات سے عابد سہیل بیحد متاثر بھی تھے اور قریب بھی، اس لئے وہ اپنے اسلوب کو سنبھال نہیں سکے۔ اور ان خاکوں پر مضمون کا گمان ہوتا ہے۔ اولڈ انڈیا کافی ہاؤس کے بہت سے کرداروں میں ایک کردار سداسرن مسرا کا تھا۔ سب کے یار، کافی ہاؤس کے عاشق، مجاز کے شیدائی، عابد سہیل ان کا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔

''سداسرن مسرا..... اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں ملازم تھے۔ دو دو دن کسی اطلاع کے بغیر دفتر سے غائب رہتے لیکن کچھ تو شخصیت کے موہنی اور کچھ اپنے کام میں چوکھے ہونے کی وجہ سے بات کبھی زبانی تنبیہ سے آگے نہ بڑھتی۔ آگے بیل نہ پیچھے پگہا، کوئی دوست اصرار کرتا تو ہفتہ دس دن اس کے یہاں ٹھہر جاتے۔ روز آنا نہ سہی تو ہر دوسرے تیسرے دن اپنے گھر سے ایک جوڑا کپڑا لے آتے اور طبیعت اوب جاتی تو کچھ کہے سنے بغیر کسی اور دوست کے گھر چلے جاتے۔ میلے کپڑے اسی گھر میں چھوڑ آتے۔ کوئی یاد دلاتا تو کہتے ہاں کسی دن آکر لے جاؤں گا۔ پھر کہتے اماں وہ کپڑے تو میلے ہیں، لانڈری میں دے دو اور رسید مجھے۔ کپڑے لانڈری میں دے دیئے جاتے اور رسید ان کے پاس سے کھو جاتی ہے''

(کھلی کتاب ص204)

عابد سہیل نے خاکہ نگاری میں بعض تجربے بھی کئے ہیں۔ ان کا ایک تجربہ تو اولڈ انڈیا کافی ہاؤس اور ماہنامہ کتاب کے خاکے ہیں یعنی کسی غیر ذی روح کا خاکہ، اس کے علاوہ انھوں نے ایک خاکہ صرف خطوط سے ترتیب دیا ہے اور یہ ایک پُراثر خاکہ ہے۔ خاکے کا عنوان ہے 'سریندر کمار مہرا'۔ اس میں نہ ان کا حلیہ بتایا گیا ہے اور نہ خود عابد سہیل نے ان کے بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ خاکہ ایک خط سے شروع ہوتا ہے جس میں ایک افسانہ نگار اپنی پریشانیوں کے ذکر کے ساتھ اپنی جان دینے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے اور آخر میں اس کی موت کی خبر پر خاکہ ختم ہوتا ہے، اس کے درمیان کئی خطوط ہیں۔ سارے خاکے میں خاکہ نگار کا کام صرف خطوں کے درمیان چند سطروں سے انہیں ربط دینا ہے لیکن عابد سہیل نے جس طرح اسے ترتیب دیا ہے، اس میں ان کے زیادہ نہ لکھنے کے باوجود سریندر کمار مہرا کی پوری شخصیت اور ان کی ذہنی کیفیت کی تصویر آجاتی

ہے۔ یہ خاکہ اپنے تاثر میں عابد سہیل کے سب سے زیادہ پُراثر خاکوں میں شمار ہوگا۔

ان کے خاکوں میں سیوا رام شرما، عابد سہیل کا سب سے مختصر خاکہ ہے یعنی صرف دو صفحے کا خاکہ ہے لیکن اس کے پڑھنے کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد سیوا رام شرما سے واقف نہیں۔ عابد سہیل نے اتنی خوبصورتی کے ساتھ چند جملوں میں انکی شخصیت، انکی علمیت، ان کا طریق تعلیم اور ان کے مزاج کی تصویر کھینچ دی ہے کہ شاید پوری کتاب لکھنے پر بھی اتنی اچھی تصویر نہیں بن سکتی تھی۔ خاکے کی خوبی یہی ہے کہ خاکہ نگار جس شخصیت کا خاکہ پیش کر رہا ہے اس سے واقفیت یا اس کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے باوجود قاری اس سے پیدا ہونے والے تاثر کو محسوس کر سکے، سیوا رام ان کا اسی طرح کا خاکہ ہے۔ یہاں پر عابد سہیل کا 'قیصر تمکین' پر لکھے خاکے کا ذکر نہ کروں تو یہ مضمون مکمل نہیں کہلائے گا۔ قیصر تمکین میرے دوستوں میں بھی تھے۔ ان کی انا کا یہ عالم تھا کہ وہ بی اے میں پڑھتے تھے، میں بی اے آنرز اردو کر رہا تھا۔ ایک دن میں نے پوچھا قیصر تمکین تم اردو کیوں نہیں پڑھتے، کہنے لگے، جن لوگوں کے ساتھ میں شام کو کافی ہاؤس میں کافی پیتا ہوں وہی مجھے پڑھائیں گے۔ میری اردو ویسے ہی اچھی ہے'' میں حیرت سے ان کا منہ دیکھتا رہا۔ بہرحال اس وقت میں ذکر کر رہا تھا عابد سہیل کے خاکے کا جسکا پہلا جملہ ہی ایک خاکہ ہے۔

''قیصر تمکین کا انتقال مجاز کے لکھنؤ کی آخری بہار کا سلام الوداعی ہے، الوداعی نہیں تو تقریباً الوداعی''

(پورے، آدھے، ادھورے، ص163)

اس ایک چھوٹے سے جملے میں عابد سہیل نے مجاز، لکھنؤ کی تہذیبی، حیثیت اور قیصر تمکین کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ ممکن ہے کہہ دیا۔ ایسے بلیغ جملے جسمیں ایک عہد سما جائے کم ہی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس زمانے کے نوجوانوں میں عابد سہیل اور قیصر تمکین سب سے زیادہ پڑھنے والوں میں تھے۔ پڑھتے ہم لوگ بھی تھے لیکن ان سے جیت نہیں پاتے تھے، قیصر تمکین کا یہ حال ہمیشہ رہا۔ ایک بار میں لندن میں افتخار عارف کا مہمان تھا، انہیں اطلاع ملی تو مجھ سے ملنے آئے، وہ لندن ٹائمز میں کام کرتے تھے۔ دوسرے دن وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس دن انہیں شام کو اخبار میں جانا تھا، دوپہر کا کھانا مجھے ہوٹل میں کھلایا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی کار کی بیک اسکرین کے ساتھ دو رویا تقریباً 50 کتابیں ڈک پر لگی ہوئی ہیں۔ میں نے دریافت کیا، قیصر یہ تم لائبریری لے کر گھومتے رہتے ہو۔ کہنے لگے کہ یہ لائبریری نہیں، میرا گھر ہے۔ میرا زیادہ وقت تو اسی میں گزرتا ہے۔ ہم لوگ دن بھر ساتھ رہے لیکن وہ صرف لکھنؤ اور لکھنؤ والوں کی باتیں کرتے رہے۔ ایک ایک کے بارے میں دریافت کرتے، اپنے لکھنؤ کے زمانے اور لوگوں کی باتیں کرتے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وطن چھوڑنے کا کرب کیا ہوتا ہے۔ پڑھنے کا یہ شوق انہیں طالب علمی کے زمانے سے تھا، عابد سہیل نے لکھا ہے کہ

''قیصر کی رات کی ڈیوٹی تھی، وہ یونیورسٹی سے واپسی میں دفتر آئے۔ کارلائل پر کوئی کتاب ان کے ہاتھ میں تھی، رخصت ہوتے وقت انھوں نے دفتر کے چپراسی مدار بخش کو ''اتفاقی چھٹی'' کی درخواست پکڑادی۔ مدار بخش نے عشرت علی صدیقی صاحب کو درخواست پیش کی تو منظر سلیم آس پاس تھے۔ عشرت صاحب نے ان سے کہا۔

''یہ قیصر تمکین کو کیا ہوگیا ہے، رات کی ڈیوٹی میں چھٹی لے لی''

منظر سلیم نے کہا ''انہیں کارلائل ہوگیا ہے''

عشرت صاحب کارلائل کو کالرا سمجھے، بولے، ہیں، ابھی تو اچھے خاصے تھے''

سب لوگ ہنس دیئے، پھر انھوں نے پرچہ لکھ کر مدار بخش کو ان کے گھر بھیجا۔ وہ ڈیوٹی پر آ گئے''

(پورے، آدھے، ادھورے، ص165)

عابد سہیل نے بہت خاکے لکھے ہیں، کچھ کتابی شکل میں شائع ہوگئے اور کچھ ان کی خودنوشت 'جو یاد رہا' کا حصہ بن گئے۔ میرے خیال میں ''جو یاد رہا'' کا بڑا حصہ خاکوں پر مبنی ہے اور یہ خاکے 'جو یاد رہا' کی خوبیوں کا ایک حصہ ہیں۔

خاکوں کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ یہ 'شخصیت کا ایک کھلا ہوا تعارف' ہوتا ہے لیکن شاید یہ تعریف کافی نہیں ہے۔ خاکہ شگفتہ زبان میں کسی شخص، خواہ وہ ادیب و شاعر، فنکار و دانشور ہو یا نہ ہو کی 'شناخت' ہے۔ ظاہر ہے کہ شناخت کسی ایک پہلو سے نہیں ہوتی، اس لیے خاکہ نگار کو شخصیت کے ہر پہلو پر نگاہ رکھنی ضروری ہوتی ہے۔ اگر کسی طرح کوئی پہلو نظر انداز ہوگیا تو وہ خاکہ مکمل خاکہ نہیں کہلائے گا۔ اس طرح اس شناخت میں اس کا زمانہ بھی شامل ہوجاتا ہے۔ عابد سہیل کے خاکوں کا اگر ہم اسی روشنی میں مطالعہ کریں تو ان کے خاکوں میں کسی طرح کی تشنگی نہیں محسوس ہوگی۔ خواہ وہ اولڈ انڈیا کافی ہاؤس کا خاکہ ہو یا اپنے عہد کے ناقد و دانشور احتشام حسین کا دوست احمد جمال پاشا، خواجہ محمد رائق یا ڈاکٹر عبدالعلیم کا جن سے انہیں سب سے زیادہ عقیدت تھی۔ ایسی مختلف عقیدتمندانہ اور جذباتی سطحوں پر خاکے کو متوازن رکھنا ہی خاکہ نگار کا ہنر ہے اور عابد سہیل کے ہنر کا ان کے ہر خاکے میں اظہار ہوتا ہے۔ خاص طور پر 'پورے، آدھے، ادھورے کے، خاکے اردو خاکہ نگاری میں ہمیشہ اہمیت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

□□□

عابد سہیل: کھلی کتاب بند کتاب

شکیل صدیقی
تلک رائے تالاب، راجہ جی پورم، لکھنؤ
موبائل: 9839123525

کثیر الجہات شخصیت کے مالک، مشہور و معروف ادیب اور صحافی عابد سہیل کی ایک اہم کتاب کا عنوان ہے 'کھلی کتاب' ان کی شخصیت اور ادبی خدمات پر کام کرنے والے ڈاکٹر شکیل احمد نے اس عنوان سے متاثر ہوکر بطور خراج عقیدت ایک کتاب لکھی، 'بند کتاب سے کھلی کتاب تک'۔ اتفاق سے سہیل صاحب کی پرکشش شخصیت اور ان کی زندگی پر یہ عنوان کھرا اترتا ہے۔ ان کی شخصیت کو بند بند کہنے والے حضرات بھی مل جائیں گے۔ ان کے ریزرو رہنے کا خیال بہت عام ہے۔ حالانکہ نیر مسعود صاحب ہوں یا عابد سہیل، ان سے کوئی بھی مل سکتا تھا۔ آدمی کی پرکھ دونوں میں بلا کی تھی۔ اگر ان سے ملنے والا ان کے معیار مذاق پر کھرا اتر گیا تو گفتگو کا ایسا دور چل نکلتا کہ وہ وہ باتیں ہوتیں اور وہ وہ قہقہے گونجتے کہ آنے والے شخص کے سامنے حیران ہونے کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا۔ اتنا ضرور ہے کہ جیسی علمی اور پر لطف گفتگو نیر بھائی کر لیتے، عابد بھائی نہیں۔ عابد بھائی قہقہے لگانے میں انہیں مات دے دیتے۔ نیر بھائی کے قہقہوں میں آواز کم ہوتی۔ لکھنوی نفاست ان کی ہر ادا پر غالب تھی۔ عابد بھائی کی زندگی میں یوروپین ایٹی کیٹس کے ساتھ ہی مشرقی تہذیب کا خاصہ دخل تھا۔ اگر وہ پائپ یا سگار نہ پی رہے ہوں تو ان کی علمی سطح اور اس کی وسعت کا اندازہ لگا پانا بہت مشکل تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کھلتے تھے، احتیاط سے کھلتے اور پوری طرح کبھی نہیں کھلتے تھے۔

مجھے ایسا کوئی شخص یاد نہیں آرہا جس کا ساتھ عابد بھائی سے اتنا زیادہ اور اتنا پرانا ہو جتنا کہ میرا تھا اور جو ان کے خاندان کے تقریباً سبھی افراد سے واقف ہو۔ جن دنوں ان کا قیام چوک کے ٹکسال والے گھر میں تھا، جو مشہور تاجر اصغر علی محمد علی کی کوٹھی کے قریب تھا، غالباً انہیں کی ملکیت تھا تب سے میں ان کے یہاں جانے لگا تھا۔ ان دنوں میری، میرے والدین اور دیگر متعلقین کی رہائش مرتضیٰ حسین روڈ واقع جس سمیع منزل میں تھا، اس کے ٹھیک پیچھے ایک چھوٹے سے میدان کے بعد ان کی ایک خالہ یعنی ڈاکٹر عبد العلیم صاحب کی سگی چھوٹی بہن حمیدہ صاحبہ کرائے کے ایک مکان میں رہتی تھیں جو زیبا صلاح الدین صاحبہ کی ملکیت میں تھا۔ عابد بھائی کی والدہ اور ان کے بھائی بہن بھی اکثر وہاں آتے رہتے۔ ہم بھائی بہنوں کا بھی وہاں بہت آنا جانا تھا۔ ہم لوگ بھی ان کو خالہ جان کہنے لگے تھے۔ اس طرح ہم لوگوں کی بے تکلفی عابد بھائی اور ان کے اہل خاندان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ میری ان کی باتیں بھی خوب ہوتی تھیں۔ مختلف موضوعات پر ہوتیں یہاں تک کہ ادب، کمیونسٹ اور ترقی پسند تحریک کے حوالوں سے بھی ہوتی۔ اتفاق سے میں کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسند تحریک دونوں کا کارکن تھا، اب بھی ہوں۔ بات چیت کے ان دوروں کے درمیان ان کی شاندار شخصیت کے مختلف پہلو مجھ پر منکشف ہوئے جن سے میں پہلے نا آشنا تھا۔ انیس بھابی نے بھی کئی باتیں بتائیں۔ کچھ ان کے بھائی بہنوں نے بھی۔ ان کی زندگی کے اچھے برے مختلف حالات، واقعات کا گواہ ہونے کے باوجود میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں ان کے بارے میں سب کچھ یا بہت کچھ جانتا ہوں۔

یہ عام خیال ہے کہ خودنوشت میں اس کے لکھنے والوں کا سب کچھ سامنے آجاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک خام تصور ہے۔ عابد بھائی نے 'جو یاد رہا' میں جس پائے کی حقیقت بیانی سے کام لیا ہے، وہ یقیناً جرأتمندانہ ہے۔ باوجود اس کے اسے خودنوشت کا ہی المیہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اپنے لکھنے والے کو سب کچھ سچ سچ بیان کرنے کا حلف دلانے کے باوجود سب کچھ سچ سچ نہیں بیان کروا پاتی۔ یہ میرا اپنا ذاتی تصور ہے۔ میں ماہر خودنوشت نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی عالم و فاضل۔ وہیں یہ بات ہندی اور مراٹھی میں لکھی گئی دلت مصنفین کی آپ بیتیوں کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی۔ ان میں جتنا ممکن ہوسکتا ہے، اتنا سچ بیان ہوا ہے۔ اس تذکرے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ خودنوشت میں بہت سی باتیں دوسروں کی آبرو بچانے کے لئے بھی چھپائی جاتی ہیں۔ لمبی ملاقاتوں میں میں نے کبھی ان کو، اپنی، اپنے خاندان کی بڑائی یا تعریفیں کرتے نہیں سنا۔ اتنی ہی احتیاط سے وہ دروغ گوئی سے بھی بچتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے، لکھنؤ کی ایک شخصیت کے منفی پہلوؤں کا ذکر چل نکلا۔ کچھ دیر گفتگو میں شامل رہنے کے بعد اچانک وہ چونکیں اور کہا:

'ارے ہم لوگ یہ کیا کرنے لگے' اور فوراً انہوں نے بات چیت کا پہلو بدل دیا۔ اتنا ضروری ہے کہ کبھی کبھی وہ علیم صاحب اور اپنے کسی افسانے کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بڑی تخلیقات پر مبنی کتاب کبھی پوری طرح کھلی ہوئی نہیں ہوتی۔ انہیں کھولنا پڑتا ہے۔ اس عمل میں کامیابی لازمی شرط نہیں ہے۔ ❑❑❑

عابد سہیل کی ادبی صحافت پر ایک نظر

موسیٰ رضا
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کیمپس لکھنؤ
موبائل: 9335135181

صحافت (یعنی اخبارات وغیرہ) اور ادبی صحافت (یعنی مجلّے، رسائل ماہنامہ وغیرہ) دونوں سے قاری کا رشتہ بڑا گہرا ہوتا ہے دونوں کی قرأت قاری کے علم میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں اور زمانہ کے کئی خفی پہلو جلی ہوکر سامنے آجاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا میں، خصوصاً ہندوستان کی تاریخ میں (جب سے اخبار و رسائل کی اشاعت عمل میں آئی ہے) جتنے بھی بڑے انقلابات سامنے آئے ہیں ان میں ایک بڑا حصہ صحافت یا ادبی صحافت کا رہا ہے۔

زمانہ میں بہتری لانا، عوام کو حقیقت سے آشنا کرنا ان مشترک عناصر کے باوجود صحافت اور ادبی صحافت میں ایک بنیادی اور واضح فرق یہ ہے کہ صحافت میں قلمکار اپنے جذبات کے تحت کوئی خبر نہیں لکھتا بلکہ واقعہ کو بعینہٖ بیان کر دیتا ہے نیز صحافت زمانہ کے ساتھ مقید ہوتی ہے، زمانہ گزشتہ کی خبر موجودہ اخبار میں جگہ نہیں پاتی جبکہ ادبی صحافت میں قلمکار کو اپنے جذبات کا آزادانہ اظہار کرنے کی اجازت ہوتی ہے وہ کسی بھی واقعہ سے متاثر ہوکر اسے اپنے ڈھنگ، رنگ، اسلوب و زبان میں بیان کرسکتا ہے۔ اردو کا پہلا ماہنامہ رسالہ 'خیر خواہ ہند' شمالی ہند کے مرزا پور سے 1847 میں آرسی ماتھر کی زیر نگرانی نکلا۔ لیکن اس میں زیادہ تر مضامین عیسائی مذہب کی ترویج کے لئے شائع ہوتے تھے۔

(محمد عتیق صدیقی، ہندوستان میں اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) اشاعت اول انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ 1957 ص، 28)

1822 سے 1857 کے درمیان ملک کے مختلف حصوں سے اردو اور فارسی زبان میں رسالے نکلنے شروع ہو گئے تھے یہاں تک کہ یہ سلسلہ دلی کالج تک پہنچا۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے جب دلی کالج میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالا تو طلبا کی تعلیمی صورت حال کو بہتر بنانے، سادہ اور سلیس اردو زبان کو رواج دینے کے لئے 'مطبع العلوم' پریس قائم کیا۔ اسی پریس سے انھوں نے ہفت روزہ مصور مجلہ 'قرآن السیدین' 1845 میں جاری کیا جسے بعض حضرات اخبار بھی کہتے تھے۔ (ایضاً ص 40)

یہ مجلہ مستقبل کے مجلّات کے لئے راہنما ثابت ہوا۔ خود ڈاکٹر اسپرنگر کی زبانی ملاحظہ کیجئے:

''1845 میں میں نے پے نی میگزین کی طرز پر ایک باتصویر موقت رسالے کی بنیاد ڈالی۔ اس کا نام قرآن السعدین تھا۔ گویا مشرق و مغرب، مشتری وار زہرہ تھے جن کا قرآن اس رسالے میں ہوا تھا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش تھی۔ گیارہ برس بعد جب میں ہندوستان سے رخصت ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہورہی تھی کہ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے نکل رہے تھے۔''

(اردو صحافت کی تاریخ 1822 سے 1857 تک، نادر علی خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1987 ص 160)

یہ ابتدا کے رسالے ادبی صحافت کے لئے راہ ہموار کر رہے تھے نتیجتاً دیکھتے ہی دیکھتے دلی، آگرہ، لاہور اور لکھنؤ سے ادبی رسالوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

لکھنؤ علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ ادبی رسالوں کی چھاپ یہاں نظر نہ آتی۔ عبدالعلیم شرر کا دلگداز (1887)، نوبت رائے کا خدنگ نظر (1896)، جوش کی سرپرستی میں نکلنے والا رسالہ نیا ادب، جوادی زیدی کی ادارت میں 1946 سے نکلنے والا رسالہ نیا دور وغیرہ معیاری رسالے تھے جن کی اشاعت نے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔ ان سب کے درمیان دسمبر 1962 سے لیکر جولائی 1975 تک نکلنے والے ماہنامہ رسالہ 'کتاب' کا اپنی علیحدہ شناخت قائم کرنا رسالہ کے معیاری ہونے کا ثبوت ہے جس کو عابد سہیل جیسے صحافی کی سرپرستی حاصل تھی جو قومی آواز کے بعد نیشنل ہیرالڈ میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ عابد سہیل ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے مگر ان کا رسالہ ماہنامہ 'کتاب' کسی نظریہ کا پابند نہیں تھا اس میں ہمیشہ صحتمند ادبی مضامین اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ بزبان عابد سہیل کتاب کے اغراض و مقاصد ملاحظہ ہوں

''کتاب ایک خاص متوازن ماہنامہ تھا ترقی پسند لیکن کسی قسم کی انتہا پسندی سے کوسوں دور، روشن خیال لیکن صحتمند ادبی اور سماجی روایات کے چوکھٹے سے گھرا ہوا۔ اردو کے حقوق کے لئے سینہ سپر لیکن ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب اور عالمی شاہکاروں کو تراجم کے ذریعہ اردو کے قارئین تک پہنچانے کے لئے بے تاب۔''

(ماہنامہ کتاب کی کہانی، عابد سہیل نیا دور اردو صحافت نمبر صفحہ ۲۲۳)

اس زمانے میں رسالہ نکالنا آسان مگر اس کی

سلسلہ وار اشاعت کا برقرار رکھنا کسی کوہ گراں مایہ کا بار برداشت کرنے سے کم نہ تھا۔ شاید اسی لئے جب عابد سہیل نے عصمت چغتائی سے قلمی تعاون کا مطالبہ کیا تو عصمت چغتائی نے جواباً کہا ''افسانہ تو میں بھیج دوں لیکن رسالہ نکلے گا کتنے دن'' مگر جب عابد سہیل کے عزم محکم نے اس رسالوں کو سال سوا سال کی عمر تک پہنچایا تو عصمت نے اپنا افسانہ ''سانپ کے تلوے'' اس جملہ کے ساتھ عابد سہیل کو روانہ کیا ''کتاب کی بے غیرتی سے تنگ آ کر افسانہ بھیج رہی ہوں کمبخت بند ہی نہیں ہو چکتا''

جب ماہنامہ کتاب کی اشاعت کا فیصلہ ہوا تو عابد سہیل نیشنل ہیرالڈ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اپنا نام بطور مدیر نہیں دے سکتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے ایک دوست عبدالحلیم خاں کے گھر کی ملازمہ کے بیٹے جمیل احمد کو اس کا مدیر مقرر کیا مگر بقول عابد سہیل ''جمیل احمد طویل عرصہ تک کتاب کے ایڈیٹر رہے لیکن کتاب اور وہ ایک دوسرے کے لئے بس دور کا جلوہ تھے''۔ مجلس مشاورت میں عابد سہیل نے احتشام حسین اور حیات اللہ انصاری سے درخواست کی اور ان دونوں حضرات کی درخواست پر اپنے نام کو بھی شامل کر لیا۔ اس کے علاوہ قمر رئیس، سہیل عظیم آبادی اور رام لعل نے بھی اس رسالے میں غیر معمولی تعاون کیا۔ اشاعت کے وقت اس کی سالانہ قیمت چار روپئے اور فی پرچہ 35 نئے پیسے مقرر کی گئی تھی۔ بعد میں قدرے اضافہ کر دیا گیا تھا۔

1960 اور اس کے بعد کی تقریباً دو دہائیاں ادب کے حوالے سے بڑی اہم مانی جاتی ہیں اس زمانہ میں ادب کے سمندر میں تجربات و رجحانات اور تحریکات کی موجوں نے تلاطم مچا رکھا تھا ایسی صورت میں رسالہ کے اعتدال کو برقرار رکھنا اور غیر جانبداری کے ساتھ تحریروں کو شائع کرنا نہایت مشکل امر تھا۔ عابد سہیل چونکہ ایک تجربہ کار صحافی تھے اور تحریروں کو بہتر و معیاری بنانا خوب جانتے تھے لہٰذا انہوں نے کتاب کو 'یک رجحانی' نہ بننے دیا جس کا اندازہ پہلے شمارہ کے مشمولات ہی سے ہوتا ہے۔ 'کتاب' کا مقصد تمام اصناف ادب کو یکساں طور پر مقبولیت سے ہم کنار کرانا تھا۔ 48 صفحوں پر مشتمل اس شمارہ میں مختصر افسانے، طنزیہ، غزلیں، نظمیں، مضامین، معلوماتی مضامین، بحث اور محل نظر عنوانات کے تحت کرشن چندر، علی عباس حسینی، احمد جمال پاشا، اثر لکھنوی، منظر سلیم، من موہن تلخ، قتیل شفائی، احتشام حسین، ٹی این چک، بشیر بدر وغیرہ جیسے پایہ کے ادباء و شعرا کے کی تحریر شامل تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشاعت کے بعد ہی سے کتاب کو عوامی مقبولیت ملنا شروع ہو گئی صرف دو تین شمارے کے بعد ہی اس کی ضخامت میں اضافہ ہو گیا صفحات کی تعداد 56 تک پہنچ گئی۔

کتاب رسالہ نے اردو ادب کے فروغ میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی بہت سی ایسی منظوم و منثور تحریریں بھی شائع کیں جو غیر مطبوعہ تھیں اس سلسلہ کی شوکت تھانوی کی دو تحریریں 'شوکت تھانوی نمبر' میں شائع کیں جو عابد سہیل نے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے بڑی کاوشوں کے بعد حاصل کی تھیں۔ قرۃ العین حیدر کا مشہور افسانہ 'ملفوظات بابا حاجی گل بیگتاشی' پہلی بار اسی میں شائع ہوا نیز کرشن چندر، بیدی، علی عباس حسینی اور حیات اللہ انصاری وغیرہ کا ہر افسانہ کتاب کی اشاعت کے دوران سب سے پہلے اسی میں شائع ہوتا۔ کتاب نے ادبی نمبر کی اشاعت بھی بڑے اہتمام سے کی صرف اردو زبان ہی نہیں بلکہ دیگر زبانوں کے ادب کو اردو کے قالب میں ڈھال اردو ادب کے سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کیا۔ اس کا آغاز ہندی کہانی نمبر سے ہوا اس خاص نمبر میں شامل ہونے والی ہندی کہانیوں کا انتخاب مشہور ہندی افسانہ نگار پرساد سنگھ نے کیا اور تراجم ادارہ کی جانب سے کرائے گئے۔ اس نمبر نے اردو ہندی ادب کے درمیانی رشتہ کو مستحکم کیا۔ اس خاص نمبر کے بعد مراٹھی کہانی کا بھی ایک نمبر شائع کیا گیا ان کہانیوں کا انتخاب اور ترجمہ نور پرکار نے کیا بعد میں یہ افسانے 'سبزۂ بیگانہ' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے، ان کے علاوہ اردو افسانہ نمبر، علی عباس حسینی نمبر، شوکت تھانوی نمبر بھی بڑے مقبول ہوئے۔

کتاب نے خاص گوشوں کی اشاعت بھی کی جن سے ادبی شخصیتوں کے احوال و فن سے آشنا ہونے کا موقع میسر ہوا۔ ان میں گوشہ مصطفی زیدی، احتشام حسین، سجاد ظہیر، کرشن چندر اور راجیندر سنگھ بیدی کو کافی پسند کیا گیا۔ کتاب میں چھپنے والے مضامین زیادہ تر تنقیدی اور تجزیاتی ہوتے۔ ادب اور ادیب کے درمیانی تناسب اور عصری تقاضوں کے پیش نظر کتاب میں چھپنے والے مضامین کو کافی پسند کیا گیا۔ ان میں کے بعض عناوین اس طرح ہیں:

'کرشن چندر کی فنکاری (قمر رئیس، جون، 1970)، رام لال کے افسانے (عابد سہیل، نومبر، 1963)، جدید افسانہ ایک مسئلہ (قاضی عبد الستار، جولائی 1972)، اردو افسانے کے تین دور (وزیر آغا، جنوری 1964)۔

عابد سہیل نے رسالہ کتاب کے معیار و وقار کو ہمیشہ برقرار رکھا نہ کسی کے رعب میں آ کر اصولوں کو تبدیل کیا اور نہ کسی جذبات و احساسات کے تحت انتہا پسندی سے کام لیا۔ ایک دفعہ باقر مہدی نے ایک نظم اور دو غزلیں بھیجیں وہ چاہتے تھے کہ نظم دو صفحہ پر چھاپی جائے اور غزلیں ایک ایک صفحہ پر۔ لیکن عابد سہیل نے باقر مہدی سے معاملات کے بگڑ جانے کی فکر کئے بغیر اسے اپنی سہولت کے اعتبار سے شائع کیا۔ دوسری جگہ عابد سہیل لکھتے ہیں:

''کتاب نے تخلیقات کے انتخاب کے سلسلہ میں کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا راجہ مہدی علی خاں کی ایک نظم کی اشاعت سے معذوری ظاہر کی تو انہوں نے وہی نظم پنجاب کے ایک مشہور

جریدے کے خاص نمبر میں چھپوا کر رسالہ رجسٹری سے مجھے بھیجا ساتھ میں نئی نظم بھی تھی۔ جواب میں انھیں لکھا گیا کہ پنجاب کے رسائل کو جو آزادیاں حاصل ہیں وہ افسوس 'کتاب' کو حاصل نہیں ہیں۔''

(صفحہ 225)

'کتاب' کی مقبولیت اور اس کے وقار کی عظمت کا ایک سبب یہ بھی رہا کہ عابد سہیل نے قاری کے جذبات اور عقیدت کا ہمیشہ خیال رکھا کتاب کے مشمولات سے کسی کی دل آزاری نہ ہو اس کی سختی سے پابندی کی۔ ایک دفعہ کوثر چاند پوری کے افسانہ 'چور راستے' پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا تو کتاب کے دوسرے شمارے میں اس پر اظہار افسوس کر کے یہ باور کرایا کہ ادارہ کا مقصد کسی فرقہ کیا فرد واحد کی دل آزاری بھی نہ تھا۔

زمانہ کے ساتھ زندگی کا بدلنا فطری عمل ہے اور زندگی کے ساتھ ادب کا تبدیل ہونا ادب کی بقا کے لئے لازمی فعل۔ عصری میلانات و ترجیحات کے پابند ہوئے بغیر حالات حاضرہ کے مسائل کو بیان کرنا ایک سنجیدہ ادیب کی ذمہ داری ہے یہ ذمہ داری اس وقت شدید ہوجاتی ہے جب زندگی کے ہر شعبہ میں ہلچل نظر آرہی ہو۔ عابد سہیل ادیب کو اس کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج ہندوستان میں جن متضاد و سیاسی رجحانات اور فکری میلانات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ہمیں ان میں سے کسی نہ کسی سے ذہنی طور پر وابستہ ہونا ہی پڑے گا۔ ہماری قوت ممیزہ کو اس آزمائش سے گزرنا پڑے گا کہ ہم کن خیالات کو کن دوسرے خیالات پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہم یہ کہہ کر ادیب نہیں بنے رہ سکتے کہ ہمارے لئے تمام صورتیں یکساں ہیں اور ہر راستہ ایک ہی طرف لے جانے والا ہے، ہر خیال درست ہے اور ہر نقطہ نظر برابر ہے۔ ہم کسی کو ترجیح دے کر اپنے کو پابند نہیں بنانا چاہتے یہ خود فریبی ہے اور وہ بھی مصنوعی قسم کی۔ کیونکہ ہماری ادبی زندگی ہماری پوری زندگی سے الگ نہیں ہوسکتی۔ جو ادیب بے روک فکری آزادی چاہتے ہیں وہ بھی چند ہی خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اپنی ترجیحات کے دائرے بنا لیتے ہیں اس لئے اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ عصری زندگی اور ادب کے تعلق پر زیادہ سے زیادہ بحث کی جائے اور جو باتیں محض علامتوں اور استعاروں میں کہی جاتی ہیں ان کا اظہار برملا بھی کیا جائے۔''

جب ماہنامہ کتاب کی اشاعت کا فیصلہ ہوا تو عابد سہیل نیشنل ہیرالڈ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اپنا نام بطور مدیر نہیں دے سکتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے ایک دوست عبدالحلیم خاں کے گھر کی ملازمہ کے بیٹے جمیل احمد کو اس کا مدیر مقرر کیا مگر بقول عابد سہیل ''جمیل احمد طویل عرصہ تک کتاب کے ایڈیٹر رہے لیکن کتاب اور وہ ایک دوسرے کے لئے بس دور کا جلوہ تھے'' مجلس مشاورت میں عابد سہیل نے احتشام حسین اور حیات اللہ انصاری سے درخواست کی اور ان دونوں حضرات کی درخواست پر اپنے نام کو بھی شامل کرلیا۔

(کتاب فروری، 1970 ص 1)

عابد سہیل نے رسالہ کی اشاعت کے وقت ہی یہ عزم کرلیا تھا کہ کوئی عطیہ قبول نہ کروں گا۔ جس پر وہ آخر تک قائم رہے مگر رسالہ کی مسلسل اشاعت اور ضخامت میں اضافہ نے عابد سہیل کو دوراہوں پہ لا کے کھڑا کر دیا تھا یا تو عابد سہیل اپنی عہدہ کے اثر و رسوخ کی مدد سے محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ جو تمام محکموں کے اشتہارات جاری کرتا ہے کتاب کے لئے بھی اشتہارات حاصل کرتے، لیکن بقول عابد سہیل ''دماغ میں ایمانداری کا کیڑا رینگا کرتا اور ایم سی کی یہ توقع بھی کہ I hope you will seel the artclis not for your self. ہر وقت دل و دماغ پہ پہرا دیتی رہتی۔'' لہٰذا عابد سہیل نے دوسری راہ اختیار کی اور جولائی 1975 کو کتاب کا ضخیم الوداعی رسالہ شائع کر کے اسے الوداع کہہ دیا اور ایسا شاید پہلی مرتبہ ہوا کہ ایک ایک قارئین کی باقی ماندہ زرسالانہ رقم 2 مہینہ کے اندر واپس کر دی گئی۔ الوداعی شمارہ کی ضخامت بھی دو ڈھائی سو صفحات سے کم نہ تھی۔ چودہ ساڑھے چودہ سو کاپی چھپوانے کے باوجود بھی تمام لوگوں کو مہیا نہیں کرائی جاسکی۔ عابد سہیل کی سرپرستی کا نتیجہ تھا جو رسالہ کتاب نے مختصر سی مدت میں مقبولیت کا یہ سفر طے کیا۔ عابد سہیل کو اس رسالہ سے غیر معمولی انسیت تھی بقول قاضی عبدالستار:

''عابد سہیل کی بیگم کو عابد سہیل کے کسی دوست کے بجائے ''کتاب'' سے شکایت رہتی ہے۔ اس لئے کہ عابد سہیل نے ''کتاب'' کو گود لے رکھا ہے، اور وہ اسے اپنی اکلوتی بیٹی پر فضیلت دیتے ہیں۔''

(اردو میں رپورتاژ نگاری، عبدالعزیز، ملی ساتی بک ڈپو، ص ۲۲۸)

ادیبوں اور خاص طور سے افسانہ نگاروں کی اس نسل کا بڑا حصہ جو 1980 کے آس پاس ادب کے افق پر ابھرا بڑی حد تک کتاب ہی کے ذریعہ متعارف ہوا یا پہچانا گیا جیسے نیر مسعود، سردار جعفری، ڈاکٹر قمر رئیس، قاضی عبدالستار، اقبال مجید، راجندر سنگھ بیدی، ندا فاضلی، اقبال متین، جوگندر پال، بلراج کومل وغیرہ۔ ماہنامہ 'کتاب' نے تقریباً 13 سال تنقیدی اور نئے رجحانات و مسائل پر مشتمل مضامین اور خصوصی نمبروں و گوشوں کی اشاعت سے اردو ادب کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے جس نے اردو کی ادبی روایت کو مستحکم کیا ہے۔

□□□

احسن رضوی
B1/4، بالڈا روڈ کالونی، نشاط گنج، لکھنؤ
موبائل: 9415016906

وہ اک احساس

وہ اک منظر جوان آنکھوں میں بستا ہے
اترتا دل میں ہے
احساس بن کر
ذہن میں محفوظ رہتا ہے
جو مجھ کو سوچنے اور فکر کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے
وہ اک احساس
جو اکثر مجھے سونے نہیں دیتا
مجھے رہ رہ کے جو
اظہار پر آمادہ کرتا ہے
مجھے اشعار کہنے کے لئے مجبور کرتا ہے
جو اندر اندر میرے ذہن کو مسرور کرتا ہے
مجھے مخمور کرتا ہے

غزل

شہر میں پھر نہیں اماں دیکھو
اٹھ رہا ہے کہیں دھواں دیکھو

تم تو اچھے رفیق تھے میرے
ہو گئے تم بھی بدگماں دیکھو

میری آنکھوں میں پھر نمی آئی
پھر ہوا کوئی مہرباں دیکھو

اونچے پربت سے گہرے ساگر تک
ہم ملے ہیں کہاں کہاں دیکھو

ہم جو بیٹھے ہیں دیر سے گم صم
ہو گیا وقت کا زیاں دیکھو

تم کو کیا کچھ نہ یاد آئے گا
گزرے لمحوں کے درمیاں دیکھو

دھڑکنیں دل کی کہتی ہیں احسنؔ
کچھ تو ہے اپنے درمیاں دیکھو

مسرور صغریٰ
وشو بھارتی، شانتی نکیتن، بول پور (مغربی بنگال)
موبائل: 9643957254

موت

قصۂ زیست کا دنیا میں یہ ہے آخری حرف
مہر ارمان اسے دیکھ کے ہو جاتا ہے برف
مرحلہ آخری جیسے بدن و روح کا ہے
غم سے لبریز یہ قصہ تو کسی نوح کا ہے
اسی لمحہ ہی ارادوں کی کماں ٹوٹے ہے
بن کے قزاق تری زیست اجل لوٹے ہے
یوں چلی آتی ہے گو پھول سے خوشبو ہو جدا
ہوتا ہے موج کی رفتار سے ہر جادو جدا
مہرباں گنبد دوار ہوا کرتا ہے
درد و وحشت کا یہ زوار ہوا کرتا ہے
یہیں تھکتے ہیں خیالوں کے جنوں خیز قدم
یہیں آتے ہیں دلیروں کی جبینوں پہ ورم
چشم قدرت کے اشاروں پہ جلا دیتی ہے
کتنے افسانے تہہ خاک سلا دیتی ہے
سرخ یادوں کا سبھی خون بہا دیتی ہے
کتنے گل کھلنے سے پہلے ہی خزاں نے لوٹے
اس نے پنجہ جو کسا، پیر و جواں سب ٹوٹے
بیس بالشت زمیں بس ترا سرمایہ بنے
دائمی نقش ہی تا حشر ترا جا یہ بنے
سلسلہ شام و سحر خواب کا ہم شکل لگے
ہیں رواں موجیں جو حسرت کی انہیں قفل لگے
جس پہ ڈالے یہ نظر زیست اسے آئے نہ راس
دے فقیروں کو امیروں کو یہ یک رنگ لباس

علم

یہ جو مل جائے تو جینے کا سلیقہ دے دے
زخم کو چین سے سینے کا سلیقہ دے دے
دل میں عالم کے یہ رہتا ہے سخاوت بن کر
دل عابد میں یہ بستا ہے عبادت بن کر
مرد میداں کی شمشیر شجاعت بن کر
اس کے لہجے میں رواں موج کی طغیانی ہے
اسی کی ہر سانس میں زاہد کی بھی جوانی ہے
پلک پہ اس کو بٹھانے کی اک کہانی ہے
اس کی وادی میں کہیں دشت و بیابان نہیں
اس کی راتوں میں اندھیروں کا کچھ گمان نہیں
اس کے شعلوں سے تو جلنے کا بھی امکان نہیں
زندگی دیتا ہے مردوں کو یہ بے جان نہیں
سر میداں متخاصم کو یہ مبہوت کرے
نقد جاں خیر تری دفن یہ شہتوت کرے
ہر نفس جاہ و حشم مظہر یزدانی ہے
محضر قلب جری پر یہ زر افشانی ہے
جلوۂ خیر مکیں آل عبا کی یہ نقیب
نقش ہے نصر من اللہ تو ہے فتح قریب
نخل اشرار میں جب بن کے اجل آ جائے
قصر کفار میں ایماں کی فضا چھا جائے
یہ کتابیں بڑی میٹھی ہیں کہ میٹھا ہے تو
دیکھ تھک ہار کے پھر راہ میں جو بیٹھا ہے تو
تو جو ہارا تو سر خاک یہ ارماں ہوں گے
تو جو جیتا تو سبھی خار گلستاں ہوں گے

محبت کی پناہوں میں

کبھی ٹی وی کو رنگت بخشتے رنگیں گلابوں میں
برستے ساونوں، پروائیوں کے نرم راگوں میں
میں اس کو دیکھتا ہوں، رات دن اپنے خیالوں میں
مجھے آواز دیتی ہے
وہ تنہائی کے غاروں میں
غموں کی زرد راہوں میں
خوشی کی بزم گاہوں میں
محبت کی پناہوں میں!

خواب شفاف ہو گئے میرے

خواب شفاف ہو گئے میرے
میرا ہونا مجھے ہوا معلوم
جیسی سوچی تھی زندگی پائی
غم سے میری خوشی اُبھر آئی
لمبی چوڑی تھی یا تھی چھوٹی سی
زندگی تھی مزے کی بوٹی سی
لطف و راحت کا سازِ بینا تھی
'میرے ہونے' کا جب نگینہ تھی

ڈاکٹر حنیف ترین
303، ارقم اپارٹمنٹ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی
موبائل: 9971730422

نیا سال

اک نیا حصار باندھ دے
عقیدتوں کو رنگ دے
لمحے کی زنجیروں کو
شہروں کے ہر راستے کو
ہر راستہ ہر گام کو
نغموں کا سر تال دے

خزاں رسیدہ رستوں کو
سورج کی زرتاب کرن کو
رات کی ہر سرگوشی کو
نئے لمحوں کے گیت سنا دے

لفظوں کی لے کی گونج میں بھنورے
روشنیوں کے کینوس پر
پھولوں سے بھرے گلستاں کو
چڑیوں کو گیت سے بھر دے

سرحد پر کھڑے جوانوں کو
ہر دل کے ارمانوں کو
ملک کی خاطر بہے لہو کو
عزت کا معیار بنا دے
اک نیا حصار باندھ دے

الکا استھانا
24/356، عالم نگر روڈ، باؤلی چوکی، لکھنؤ
موبائل: 9307197756

غزل

بیتے ہوئے لمحوں کو سوچا تو بہت رویا
جب میں تری بستی سے گزرا تو بہت رویا

پتھر جسے کہتے تھے سب لوگ زمانے میں
کل رات نہ جانے کیوں رویا تو بہت رویا

بچپن کا زمانہ بھی کیا خوب زمانہ تھا
مٹی کا کھلونا بھی کھویا تو بہت رویا

جو جنگ کے میداں کو اک کھیل سمجھتا تھا
ہارے ہوئے لشکر کو دیکھا تو بہت رویا

جو دیکھ کے ہنستا تھا ہم جیسے فقیروں کو
شہرت کی بلندی سے اترا تو بہت رویا

ٹھہرا تھا جہاں آکر اک قافلہ پیاسوں کا
اس راہ سے جب گزرا دریا تو بہت رویا

رئیس انصاری
335/72، محمود نگر چوک، لکھنؤ
موبائل: 9415016937

غزل

روشن نہیں تو ماہ حسیں بھی تمام ہو
جب خواب مر گئے تو یقیں بھی تمام ہو

یہ جو حسین رات ہے ہونے کو ہے تمام
کیا ہوا گر کبھی یہ نہیں بھی تمام ہو

گرد سفر ہے اب بھی مرے تن پہ جا بجا
یہ بے سبب تکان کہیں بھی تمام ہو

خواہش مرے رقیب کی لگتی ہے اس طرح
ہو آسماں بھی ان کا زمیں بھی تمام ہو

ایسے مکان شہر میں اگتے ہیں ہر جگہ
ہو گھر میں حادثہ تو مکیں بھی تمام ہو

احساس یہ نثارؔ جو ہوتا ہے ہر گھڑی
جب عمر کٹ گئی تو زمیں بھی تمام ہو

احمد نثار
سٹی کالونی، پوسٹ 'بی' پالی ٹیکنک، دھنباد (جھارکھنڈ)
موبائل: 8409242211

غزل

یہ نہیں کہ ہم کوئی حیثیت نہیں رکھتے
عشق کے سوا لیکن ملکیت نہیں رکھتے

شخصیت کے سانچے میں انکو ہم نے ڈھالا ہے
لفظ شکل رکھتے ہیں شخصیت نہیں رکھتے

نغمگی ہے وہ تم میں نغمے رشک کرتے ہیں
شعر بھی تمہاری سی شعریت نہیں رکھتے

آپ ہیں خفا ہم سے، جایئے خفا رہیئے
اپنے ساتھ ہم کوئی بوریت نہیں رکھتے

انکی بھی طبیعت ہے بھولے بھالے بچوں سی
پھول اپنے چہرے پر یاسیت نہیں رکھتے

یوں تو ان کی محفل میں حاضری ہے ان کی بھی
بات صرف اتنی ہے اہمیت نہیں رکھتے

کیوں اکیلے پھرتے ہیں، کیوں اداس رہتے ہیں
آپ کیا کسی دل میں شہریت نہیں رکھتے

ظفرؔ صہبائی
عارف نگر، بیرسیہ روڈ، بھوپال
موبائل: 9755710295

غزل

ہم نے جب رکھ دئے سجا کے چراغ
بجھ گئے سرپھری ہَوا کے چراغ

جلتے بجھتے ہوئے حیا کے چراغ
تیری آنکھیں ہیں تو وفا کے چراغ

مجھ سے کہنے لگے خدا حافظ
اُس کی پلکوں پہ مسکرا کے چراغ

اُس نے اک چاند کر لیا تخلیق
میرے طاقوں سے سب اٹھا کے چراغ

سہہ رہے ہیں اذیتیں کتنی
دیکھئے تو قریب آکے چراغ

تیرگی کا غرور توڑ دیا
ہم نے ہر موڑ پر جلا کے چراغ

اس نے عرفانؔ کہہ دیا آمین
سرخرو ہیں مری دعا کے چراغ

عرفانؔ لکھنوی
سیتاپور روڈ، نزد سرور مانٹیسری اسکول، کھدرا لکھنؤ
موبائل: 9305739527

غزل

نہ وہ زبان کی شوخی مرے بیان میں ہے
نہ اب وہ حسن سماعت کسی کے کان میں ہے

وہ مجھ سے پوچھ رہا ہے ترا مرا رشتہ
بتاؤں کیسے وہی ہے جو جسم و جان میں ہے

مری پسند کی گڑیا نظر نہیں آتی
سنا ہر ایک کھلونا تری دکان میں ہے

بدل نہ دے وہ کہیں رُخ ترے سفینے کا
جو ایک چھوٹا سا سوراخ بادبان میں ہے

یہ کہہ کے وار دوبارہ کیا ہے قاتل نے
ذرا سی جان ابھی اس لہولہان میں ہے

رہِ وفا پہ مرے صرف نقش پا ہی نہیں
مرا لہو بھی مرے پاؤں کے نشان میں ہے

نہ جانے کون سی آندھی بکھیر دے بیخودؔ
ہر ایک شخص یہاں ریت کے مکان میں ہے

رام پرکاش بیخودؔ
مکان نمبر 183، چندن، اندرا نگر، لکھنؤ
موبائل: 9450359535

غزل

دل کی دہلیز چونک جاتی ہے
جب بھی آہٹ کسی کی آتی ہے

دیکھنا یہ ہے زندگی کی طرف
زندگی! کب قدم بڑھاتی ہے

کچھ تو پروا دل کی کر پگلی!
کاہے پتھر سے دل لگاتی ہے،

کوئی آتا ہے خواب میں میرے
اور پھر نیند ٹوٹ جاتی ہے،

زندگی کو بتایئے صاحب
زندگی کیسے مسکراتی ہے

کوئی دیوار ہے نہ در دل میں
پھر یہ دستک کہاں سے آتی ہے

دل میں اٹھتی ہے ہوک سی رخشاں
ریل سیٹی جہاں بجاتی ہے

رخشاں ہاشمی
محلہ دلاپور، منگیر (بہار)
موبائل: 9546315545

غزل

جو تیرے شہر سے میں دربدر نہیں ہوتا
تو میرا عشق کبھی معتبر نہیں ہوتا

یہ عرش و فرش تری مٹھیوں میں ہوتے بند
تو اپنے حال سے گر بے خبر نہیں ہوتا

مزہ تو جب ہے مرے ساتھ ساتھ تو بھی چل
رہِ وفا میں اکیلے سفر نہیں ہوتا

رہِ حیات میں ایسا بھی موڑ آتا ہے
شریکِ حال کوئی ہم سفر نہیں ہوتا

تمام عمر نفس سے جہاد کرنا ہے
دو چار دن میں تو کوئی بشر نہیں ہوتا

اسی لئے تو بیاباں میں میرا مسکن ہے
حریف وعدہ شکن جانور نہیں ہوتا

ضرور کوئی کمی ہے نیازؔ جب ہی تو
جو اضطراب اِدھر ہے اُدھر نہیں ہوتا

نیازؔ سلطانپوری
بھٹی جرولی، کٹاواں، سلطانپور
موبائل: 8756228058

غزل

بتا رہے ہیں یہ تیور تیرے ابھی سے مجھے
کہ مار ڈالے گا اک روز خامشی سے مجھے

تمام عمر سفر جب اندھیری شب کا کیا
تو خوف کیوں ہو بھلا آج تیرگی سے مجھے

تری پسند جدا ہے مرا مزاج الگ
تجھے ہے رنگوں سے الفت تو سادگی سے مجھے

مری حیات کو ہر پل جوناگ بن کے ڈسے
معاف کرنا خدا ایسی زندگی سے مجھے

میں اس سفر کا ارادہ ہی ترک کر دیتا
اگر گزرنا نہ پڑتا تری گلی سے مجھے

مہیب سایہ ہراساں نہ کر سکا لیکن
'ڈرا دیا ہے پتنگوں نے روشنی سے مجھے'

کوئی گلہ مرے لب پر کبھی نہ آئے گا
پلا دے زہر بھی گر آج تو خوشی سے مجھے

فردوس گیاوی
عارف نگر، گیول بیگھا، گیا (بہار)
موبائل: 9546037777

غزل

تو مجھ کو سن رہا ہے تو سنائی کیوں نہیں دیتا
یہ کچھ الزام ہیں میرے صفائی کیوں نہیں دیتا

مرے ہنستے ہوئے لہجے سے دھوکہ کھا رہے ہو تم
مرا اترا ہوا چہرہ دکھائی کیوں نہیں دیتا

نظر انداز کر رکھا ہے دنیا نے تجھے کب سے
کسی دن اپنے ہونے کی دہائی کیوں نہیں دیتا

میں تجھ کو دیکھنے سے کس لئے محروم رہتا ہوں
عطا کرتا ہے جب نظریں رسائی کیوں نہیں دیتا

کئی لمحے چرا کر رکھ لئے تو نے الگ مجھ سے
تو مجھ کو زندگی بھر کی کمائی کیوں نہیں دیتا

خود اپنے آپ کو ہی گھیر کر بیٹھا ہے تو کب سے
اب اپنے آپ سے خود کوئی رہائی کیوں نہیں دیتا

میں تجھ کو جیت جانے کی مبارکباد دیتا ہوں
تو مجھ کو ہار جانے کی بدھائی کیوں نہیں دیتا

منیش شکلا
4/8، ڈالی باغ، آفیسرس کالونی، لکھنؤ
موبائل: 9415101115

غزل

جل اٹھی ہے تو یہ مدھم نہیں ہونے والی
مری آواز کی لَو کم نہیں ہونے والی

دیکھتے دیکھتے بجھ جائیں گے آنکھوں کے چراغ
تری تصویر تو مبہم نہیں ہونے والی

کھل کے برسے نہ تری یاد کا بادل جب تک
مرے اندر کی فضا نم نہیں ہونے والی

تجھ سے بچھڑے تو کئی بار خیال آیا ہمیں
کیا یہ خیرات نفَس کم نہیں ہونے والی

مری تنہائی ہے وہ غار تصور کی جہاں
تری آمد بھی تو ہر دم نہیں ہونے والی

یہ الگ بات خوشی ہو کہ نہ ہو جانِ مراد
تو مری ذات کا ماتم نہیں ہونے والی

موت آئے تو یہ ممکن ہے مرے زخم بھریں
زندگی تو مرا مرہم نہیں ہونے والی

ابھیشیک شکلا
6 پٹیل نگر اسٹار کالونی، سیکٹر ۹، اندرا نگر، لکھنؤ
موبائل: 9559934440

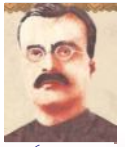

پنڈت برج نرائن چکبست
۱۸۸۲ء ۱۹۲۶ء

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

لکھنؤ کی روایتی شاعری میں جیسے ہی میر انیسؔ اور دبیرؔ برآمد ہوتے ہیں، ایک مخصوص صنفِ سخن میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب لکھنؤ ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی راجدھانی کے روپ میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ نواب آصف الدولہ سے لے کر نواب واجد علی شاہ کے دور تک دبستانِ لکھنؤ مشاہیر ادباء اور شعراء کی بہت بڑی آماجگاہ بن چکا تھا۔ پورے ہندوستان کے ادباء اور شعراء لکھنؤ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے لکھنؤ کے لئے ترستے تھے۔ لکھنؤ کا جادو پورے ہندوستان کے سر چڑھ کر بول رہا تھا لیکن یہ وہ دور بھی تھا جب مغرب کی طرف سے آنے والی ہواؤں نے اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ دبستانِ لکھنؤ جب اپنے آخری دور میں تھا تبھی پنڈت برج نرائن چکبست نے جنم لیا۔ انہیں بچپن میں انتزاعِ سلطنتِ اودھ کے ساتھ ساتھ جدیدیت کی جانب گامزن لکھنؤ نصیب ہوا۔ ان کی شاعری میں حب الوطنی کا عنصر غالباً اسی عہد کی دین ہے جسے بعد میں ان کی شاعری کا سب سے خاص اور انفرادی موضوع مانا گیا۔ ان کا بنیادی مزاج نظم گوئی کا ہے اور انہوں نے اپنی بیشتر نظمیں 'مسدس' کی ہیئت میں لکھی ہیں۔ غزلوں کی بہ نسبت انہوں نے نظمیں زیادہ کہی ہیں، اس کے باوجود ان کی غزلوں کا معنوی کینوس بہت وسیع ہے۔ غالباً ہماری اردو شعریات میں غزلوں کے حوالے سے چکبست ایک ایسا نام ہے جو مختصر غزلیں کہنے کے باوجود اس صنفِ سخن میں میں اپنا ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکری رچاؤ، لفظی تصرفات، تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع کے استعمال کے ساتھ ان کی شاعری میں معنوی تنوع و ترفع بھی پایا جاتا ہے، جو لوگوں کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی غزلوں کے دو کلیدی موضوع ہیں، ایک عشق اور دوسرے فلسفۂ موت و حیات ہے۔ چکبست نے عشقیہ مضمون کو برتنے میں بڑی فنی مہارت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے موت و حیات جیسے معروضی موضوعات کو اپنی غزلوں میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس میں کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ چکبست کی غزلیہ شاعری کو کسی اعتبار سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹ر جنوری کو پنڈت برج نرائن چکبست کی ۱۳۵ ویں یوم ولادت کے موقع پر ان کی ایک غزل کے ساتھ کچھ متفرق اشعار ہم اپنے قارئین کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ (ایڈیٹر)

غزل

درد دل پاس وفا جذبہ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

جس طرح خم میں کسی جام کا ٹکڑا نکلے
یوں ہی گردوں سے مہ نو کا نمایاں ہونا

سر میں سودا نہ رہا پاؤں میں بیڑی نہ رہی
میری تقدیر میں تھا بے سروساماں ہونا

صفحۂ دہر میں مہر ید قدرت سمجھ
پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

ہو بیاضِ سحر نور پہ دل کیا مائل
یاد ہے دفترِ انجم کا پریشاں ہونا

کل بھی وہ کل جو ہے فردائے قیامت زاہد
اور پھر اس کے لئے آج پریشاں ہونا

پاؤں زنجیر کے مشتاق ہیں اے جوشِ جنوں
ہے مگر شرط ترا سلسلہ جنباں ہونا

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اس طرہ دستار غریباں ہونا

ہے مرا ضبط جوشِ جنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

قید یوسف کو زلیخا نے کیا ، کچھ نہ کیا
دل یوسف کے لئے شرط تھا زنداں ہونا

متفرق اشعار

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کا گردشِ قسمت سے ڈر جانا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انساں سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

گنہگاروں میں شامل ہیں گناہوں میں نہیں شامل
سزا کو جانتے ہیں ہم خدا جانے خطا کیا ہے

محبت کے چمن میں مجمعِ احباب رہتا ہے
نئی جنت اسی دنیا میں ہم آباد کرتے ہیں

خدا نے عم بخشا ہے ادب احباب کرتے ہیں
یہی دولت ہے میری اور یہی جاہ و حشم میرا

زبانِ حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے
مٹایا گردشِ افلاک نے جاہ و حشم میرا

وطن کی خاک سے مرکر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

غرور جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشت خاک کو غم دو جہاں کے ہیں

لکھنؤ میں پھر ہوئی بزمِ سخن آراستہ
بعد مدت پھر ہوا ذوقِ غزل خوانی مجھے

رلایا اہلِ محفل کو نگاہِ یاس نے میری
قیامت تھی جو اک قطرہ ان آنکھوں سے جدا ہوتا

غزل

تجھی کو پڑھنا تجھی پہ لکھنا تجھی سے ہر اک سوال کرنا
چھپانا تجھ سے ہی راز دل اور تجھی سے پھر عرض حال کرنا

تم اپنی خوشیوں کی انجمن کو سجائے رکھنا یونہی ہمیشہ
نہ فکر دنیا میں تم الجھنا نہ میرا کوئی ملال کرنا

خبر بھی ہے کچھ کہ کیا قیامت ہمارے دل پر بپا کرے ہے
یہ تیرا پلکوں کو دھیرے دھیرے عروج کرنا زوال کرنا

سمجھ میں آتا نہیں ہے کچھ بھی یہ عشق میں کیا مقام آیا
ہے کتنا مشکل جواب دینا ہے کتنا مشکل سوال کرنا

نقاب رخ سے اٹھانا لیکن اٹھانا تھوڑا سا دھیرے دھیرے
بہت ہی نازک مزاج ہے دل سو دھیرے دھیرے حلال کرنا

بس اک نظر کا کمال ہے یہ بپا قیامت ہے اہل دل پر
کوئی جو سیکھے تو تم سے سیکھے کمال یہ بے مثال کرنا

خمار تیرا کبھی نہ اترے سنے ہیں تیرے کرم کے چرچے
ہمیں بھی چشم کرم سے ساقی جو ہو سکے مالا مال کرنا

رئیسہ خمار آرزوؔ
9ہل ٹاپ اپارٹمنٹ، مہاتما نگر، ناسک
موبائل: 9403707786

غزل

نہیں آؤ کہ اب آوازِ پا سے چوٹ لگتی ہے
مرے احساس پر تیری صدا سے چوٹ لگتی ہے

تجھے خود اپنی مجبوری کا اندازہ نہیں شاید
نہ کر عہدِ وفا، عہدِ وفا سے چوٹ لگتی ہے

ہواؤں! تم ذرا ٹھہرو نہ خوشبو ایسے بکھراؤ
ہوں نازک میں مجھے بادِ صبا سے چوٹ لگتی ہے

یہ خط اپنے سنبھالو تم، حسیں لمحے بھی لے جاؤ
ہمیں ایسی محبت کی عطا سے چوٹ لگتی ہے

تمہارے بعد رنگینی کوئی بھاتی نہیں مجھ کو
ہتھیلی کو بھی اب رنگِ حنا سے چوٹ لگتی ہے

مری دھڑکن میں جن بیتابیوں نے ڈیرا ڈالا ہے
انہیں بیتابیوں کی انتہا سے چوٹ لگتی ہے

بہت حساس ہے زریابؔ کو جھکنا نہیں آتا
قبا پھولوں کی بھی ہو تو قبا سے چوٹ لگتی ہے

ہاجرہ نور زریابؔ
گنگا نگر، نزد ماڈرن انگلش اسکول، اکولہ (مہاراشٹر)
موبائل: 9922318742

غزل

جب بھی تنہائی میں مجھ کو تری یاد آئی ہے
کیا کہوں کتنی طبیعت مری گھبرائی ہے

صفحۂ ذہن میں پھر کیوں نہ ہو شعروں کا نزول
ہجر کی شب ہے، تری یاد ہے، تنہائی ہے

دل دھڑکتا ہے محبت کا مرے شعروں میں
زندگی کی مرے اشعار میں سچائی ہے

دوستو! لطف و عنایات کی پیکر ہوں میں
دل مرا حسن روایات کا سودائی ہے

تجھ کو چاہا تو مرے دوست بچھڑ کر تجھ سے
دل نے ہر لمحہ تڑپنے کی سزا پائی ہے

اے خدا! بھیج دے پھر کوئی اجالوں کا سفیر
ظلمت کفر کی ہر سمت گھٹا چھائی ہے

غم کا موسم ہو کہ خوشیوں کا زمانہ عاطفؔ
میں نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے

ریحانہ عاطف خیرآبادی
گل برگ منزل، کالا پیادہ، خیرآباد اودھ، سیتاپور
موبائل: 9450374214

غزل

ہجر میں کون بتائے میں کدھر جاؤں گا
اشک غم سے میں سمندر کو بھی بھر جاؤں گا

تم نے سمجھا تھا کہ تا عمر بکھر جاؤں گا
ٹھوکریں کھا کے میں در اصل نکھر جاؤں گا

میری افسردہ نگاہی کے تلاطم سے نہ کھیل
میں تری شوخ نگاہوں سے نکھر جاؤں گا

انکا غم دیکھ کے دل میرا تڑپ اٹھتا ہے
ایک دن میں بھی سر شام بکھر جاؤں گا

تم پہ میں جان فدا کرتا رہونگا تا زیست
یہ نہ سمجھو کہ کبھی کہہ کے مکر جاؤں گا

پھر سے اٹھوں گا علیٰ الصبح کرونگا میں دھمال
یہ نہ سمجھو کہ ہوئی شام تو مرجاؤں گا

میں بھی آندھی ہوں کوئی جھونکا نہیں ہوں عینیؔ
میں نشاں چھوڑ کے شہروں سے گذر جاؤں

خادم رسول عینیؔ
ریجنل آفس یونین بینک آف انڈیا، گومتی نگر، لکھنؤ
موبائل: 9628721999

لمحہ ایک گمان کا

رخشندہ روحی مہدی
DDA،115-A فلیٹس، سکھ دیو وہار، نئی دہلی
موبائل: 9868969308

اسی چوکور کشادہ کمرے میں نرملا اور میں نے نئی زندگی کی شروعات کی تھی۔

سامنے دیوار پر فیکسڈ نرملا کی قد آدم تصویر پر دھول جمی ہے۔ سانولی، سخت..... مضبوط اور پکے اردوں والی نرملا!!۔ سکون کی طویل سانس بھرتے ہوئے میں نے اپنے بیڈروم کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔

ہوا کا گرم جھونکا نرملا کی تصویر سے ٹکرایا۔ تصویر کافی حد تک واضح ہوگئی..... سختی سے بھنچے ہونٹ، ایک دوسرے میں پیوست بھوؤں اور گالوں کی ابھری ہڈیوں کے درمیان گرد کی دبیز پرت کو چھیدتی آنکھیں مجھے ایک ٹک گھورنے لگیں۔ نرملا کی آنکھوں سے امڑتے ناگواری کے طوفان کی پرواہ کئے بغیر میں جلدی سے گرد آلود فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اے سی آن نہیں کیا۔ یہ کام میں نرملا کے دفتر جانے کے بعد اکثر کرتا تھا۔ بیڈ کے سامنے بچھا رہنے والا ایرانی قالین کونے میں کھڑا میری عارضی آزادی پر مسکرا رہا ہے۔ میں رامپور سے ممبئی نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔

لوکل ٹرین میں نرملا سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ ٹرین میں چڑھی تو کافی پریشان اور جلدی میں لگ رہی تھی۔ اسکو پسینے سے تر اور گرمی سے گھبرایا ہوا دیکھ کر میں نے اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ ''تھینکس'' نرملا نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اور جلدی سے میری چھوڑی ہوئی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میرا دل ٹرین کی رفتار کے ساتھ دوڑ پڑا۔ وہ اگلے اسٹاپ پر اتر گئی اور میں بھی۔

اسٹیشن سے باہر نکلے تو اسکی گاڑی مع ڈرائیور موجود تھی۔۔ میں سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔۔

''سنئے۔'' وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

میں نے غیر یقینی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں چرچ گیٹ جارہی ہوں۔ آپ کو ادھر جانا ہو تو میرے ساتھ چلئے۔'' دھوپ کے خطرناک تیور دیکھتے ہوئے اس آرام دہ دعوت کو مان لینا ضروری تھا۔ راستہ لمبا تھا۔ میں نے اسے اور اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا۔ جلدی جلدی چار ملاقاتوں میں میرے ذہن نے یہ قبول کرلیا کہ نرملا کے ساتھ جیون کی ڈور باندھ لینا سمجھداری ہے۔

کل ملا کر نرملا اچھی عورت اور اچھی بیوی ثابت ہوگی۔ دو چار باتوں کو گھٹا کر۔ چمچماتے فرش پر کیچڑ سے لتھڑے میرے جوتوں کے نشان۔ سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے ہر کمرے میں جابجا۔ بدبودار موزوں کے گولے بیڈ کے نیچے گھومتے ہوئے۔ ہر وہ غیر مہذب حرکت جو مجھے اچھی لگتی۔ نرملا اور میرے بیچ جنگ کا بگل بجاتی۔ ڈائننگ روم کے وال ٹو وال کارپٹ پر کئی بار چائے الٹ گئی اور..... نرملا نے کام کرنے والی کو نکال دیا۔ لیکن ڈرائینگ روم میں میرا داخلہ ایک حد تک ممنوع ہو گیا۔ ہاں ان باتوں کے علاوہ اسکو میرے ایک سے زیادہ بچے پیدا کرنے اور نوکروں سے ہمدردی کرنے کے بے جا شوق سے بھی سخت نفرت تھی۔ اچھا ہوا جو نرملا کو شادی سے پہلے میری ان کوالیٹیز کا علم نہ ہوا نہیں تو۔ مجھے اسی وقت واپسی کا ٹکٹ کٹا کر رام پور کی ٹرین میں بٹھا دیتی۔

میرے پہلے بیٹے آدرش کی پیدائش کے بعد مستقل طور پر اولاد کے جھنجھٹ سے چھٹی پا چکی تھی وہ۔ میرا احتجاج بے قیمت تھا۔ آدرش کو مجھ سے ہر طرح سے الگ بنانے کے لئے ڈے بورڈنگ اسکول میں ایڈمیشن دلوایا تھا نرملا نے اور اسکول پورا ہوتے ہی آدرش کو کالج کی پڑھائی کے لئے یو ایس لے جانے کی پوری تیاری کرنے کے بعد مجھے بتایا تھا۔ بڑے ملکوں کے طور طریقے وہ اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ خود کئی بار بزنس ٹریپ پر یورپ اور امریکہ جاتی رہی ہے۔ لیکن نوجوان بیٹے کو اکیلا بھیجنا اسے ٹھیک نہ لگا۔

آدرش کے روشن مستقبل کے لئے میں نے اپنی پرائیویٹ نوکری چھوڑ دی۔ نرملا کا بزنس تو خیر سے پھلا پھولا تھا۔ اسکے دونوں بھائی اور بھروسے کے منیجر نے سارا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ اور..... نرملا آدرش کو اور مجھے بھی لے کر چھ سال کے لئے یو ایس چلی گئی۔ بہ مشکل پونے چار سال گزرے۔ میں وہاں بھی وبال جان بن گیا اور آخر کار نرملا نے تنگ آکر کچھ وقت کے لئے مجھے ممبئی بھیج دیا ہے۔ میں اپنی سوچ پر شرمندہ سا۔ نرملا کی تصویر کی غضبناک نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ اور دھول سے اٹے بیڈ پر نرملا کی تصویر سے منھ چھپا کے لیٹ گیا۔

نرملا اپنے بزنس اور آدرش کے مستقبل کی معماری میں بے حد بزی رہتی اور میں کافی فری! میری مصروفیات میری طرح کم تر تھیں۔ صبح ۱۰ بجے اپنے

معمولی سے دفتر جانا، شام چار بجے واپس گھر لوٹ آنا۔

گھر آتے ہی نرملا کے لائے امپورٹڈ شاور جیل سے نہا کر قیمتی ڈیوڈورینٹ میں بس کر تازہ استری کئے کپڑے پہن لینا۔ چھت پر شام کے سورج کو الوداع کہتے ہوئے تاروں کے کارواں کا پرشوق استقبال کرنا۔

اور.....

برابر والی کوٹھی کی برساتی کے صحن اور میری چھت کی مشترکہ قدآدم دیوار سے لگ کر بوگن ویلیا کے گلابی پھولوں کے گچھوں کے درمیان چھپ کر گوری گوری شرمائی لجائی مسز احمد کو تاکنا۔ مسز احمد بڑے سے دوشالے میں چھپی رہتیں۔ میری طرف پیٹھ کئے اپنے کاموں میں مشغول۔ دھوپ میں انکے سنہری بال اور زیادہ سنہری ہو جاتے۔ احمد صاحب کسی ریاست کے نواب رہے ہیں شاید۔ بڑا شاہی مزاج رکھتے ہیں۔ نماز پانچ وقت سے زیادہ کی بلا ناغہ ادا کرتے۔ لیکن حقوق ازدواج سے مکمل طور پر نابلد۔ کھانے کے وقت بیگم احمد صاحب کے سامنے سفید چینی کی پلیٹ میں بھاگم بھاگ توے سے اتری گرما گرم روٹیاں رکھتیں اور ذرا دیر ہونے پر احمد صاحب کی دھاڑ کے ساتھ، وہ روٹی کے ساتھ سینک دی جاتیں۔ قورمے کے مسالے کے ساتھ بھون دی جاتیں۔ انکا گورا گورا چہرہ لال لال ہو جاتا۔ اور.....نرم گرم روٹیوں کا تانتا بندھ جاتا.....مسز احمد اکثر میرے گھر کے دروازے کے باہر نرملا سے میرے پودھوں کی تعریف کرتیں۔ گھر کے اندر آتے ہی نرملا کا شہنشاہی حکم صادر ہوتا.....اور.....چھت کے دروازے کا تالا بند ہو جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے پاس ڈپلیکیٹ چابی رہتی تھی۔ دیوالی پر نرملا احمد صاحب کے یہاں ملازمہ کے ہاتھ پرساد بھجواتی اور عید پر وہ لوگ اپنے گاؤں چلے جاتے۔ ایک عید پر احمد صاحب کو چھٹی نہیں ملی اور خوش قسمتی سے اس دن دروازہ میں نے کھولا۔

کنچن سی دھلی دھلائی کایا پر سادگی سے لپٹی بسنتی لکھنوی چکن کی ساڑی میں.....وہ میرے گھر کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ چار انگلیاں چاندی پیشانی تک لے جا کر جھجک گئیں.....آنکھوں پر بدستور سنہری دراز پلکوں کی جھالر گری رہی۔ میرے ندیدے پن کو دیکھے بغیر محسوس کر کے بے طرح بوکھلا گئیں اور..... دروازے کے آٹومیٹک ہینڈل کو مخاطب کر کے مدھم سر میں گنگنائیں۔

''عید مبارک.....یہ سوئیاں.....''

ہاتھوں میں بلوریں پیالہ.....نہیں.....بلوریں ہاتھوں میں پیالہ تھامے وہ میرے عین مقابل تھیں..... دل چاہا پیالے کے ساتھ انہیں بھی رکھ لوں۔ لیکن انکی نازک کلائیوں پر ظلم کیسے برداشت کرتا۔ میں نے جلدی سے پیالہ پکڑ لیا۔ پیالے پر انکی ملایم انگلیوں کی لطیف گرماہٹ کو میں نے اپنی سرد انگلیوں میں محسوس کیا۔

وہ جا چکی تھیں۔

اس دن میں نرملا کو یہ سمجھانے میں قاصر رہا کہ صبح سویرے میری بنائی بیڈ ٹی اتنی شیریں کیسے ہوگئی۔ نرملا کو ڈائبیٹیز تھی۔ نرملا نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر غصے سے آنکھیں تریریں تھیں۔

رات میں ٹمٹماتے تارے گنتے اکثر میں اپنے پیارے ٹرانسسٹر کا والیوم بڑھا دیتا اور چپکے سے سر اٹھا کر مسز احمد کی چھت پر جھانک لیتا۔ وہ پیٹھ موڑے احمد صاحب کے تڑپتے ہوئے تلوؤں میں اپنے حریری پوروؤں سے مالش کرتی ہوتیں اور احمد صاحب کے دلدوز خراٹوں کی گونج سنتے سنتے اونگھتی ہوئی کمرے کے در کو بھیڑ لیتیں اور میں گانے کی والیوم کو دھیما کرتے ہوئے نیچے اتر آتا۔ نرملا بے سدھ سوئی ہوتی اور میں یہ سوچتا کہ مسز احمد باہر بھی تو سو سکتی ہیں۔ مسز احمد کے برابر والے خالی فولڈنگ بیڈ پر!!

آج بھی میرا پیارہ ٹرانسسٹر یہیں سائیڈ ٹیبل پر وموجود ہے۔ ہائی اسکول کے بہترین ریزلٹ پر پتاجی نے مجھے انعام میں دیا تھا۔ جلدی سے سارے سوئچ گھما ڈالے۔ میرا ٹرانسسٹر میرا گرم جوش لمس پا کر لہک اٹھا۔

تجھے کیا سناؤں میں دل ربا تیرے سامنے میرا حال ہے
تیری ایک نگاہ کی بات ہے میری زندگی کا سوال ہے

اس دن یہی گانا سنتے ہوئے میں اپنے پودھوں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ میری نظر بے ارادہ اٹھ گئی۔ دیوار کے پار۔ احمد صاحب کے ململ جھک سفید کرتے میں گھلی ملی سفید انگلیاں گاڑے وہ کڑھائی کر رہی تھیں۔ میں بظاہر انجان سا اپنے پودھوں کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس مہانگر میں جہاں کسی کو میرے لئے وقت نہیں۔ وہ ہی تو ہیں میرے اپنے۔

بوگن ویلیہ کے گلابی گچھوں کے درمیان میں نے جھانکا۔ ململ کا جھک سفید کرتا سرخ گل بوٹوں سے سجنے لگا۔ وہ بار بار اپنی انگلی جھٹکتی رہیں۔ مگر تازہ تازہ سرخ خون کرتے کے گریبان کو سرخ کرنے لگا۔ آستینوں والے لمبے بنیان اور ٹخنوں کھلے پاجامے میں احمد صاحب باتھ روم سے باہر نکل آئے تھے۔ کرتے پر ابھرتے تازہ گل بوٹے جمعہ کی نماز میں آڑے آ گئے۔ بلوریں کلائی پر احمد صاحب کی گرفت سخت ہونے لگی۔ میرے زبان پر گانے کے بول دم توڑ گئے۔ تازہ گلاب کی نرم و نازک ٹہنی میرے ہاتھ میں چلتی لوہے کی بڑی قینچی کی ضد میں آ گئی اور ادھ کھلا گلاب بے جان ہو کر گر پڑا۔ میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہو کر ٹوٹے ہوئے پھول کو اٹھا کر پیار سے تھپتھپانے لگا۔ میں نے ہمت بٹور کر ادھر دیکھا۔ انکی چھت خالی تھی۔ میرے دل میں امید کی منی سی کرن سر اٹھا کر بولی۔ کاش۔ عید پر اس سال احمد صاحب کو چھٹی نہ ملے!! میں نے کروٹ بدلی.....ایک عرصہ کے بعد اپنے میلے بستر پر اپنے پن کا احساس بڑھ گیا۔ میں نے تکیے کو لات مار کر بستر سے نیچے گرا دیا۔ شرٹ اتار کر دور اچھال دی۔

نرملا کی قدآدم تصویر مجھے اب اور بھی ناراضگی سے گھور رہی ہے۔ ماتھے کی بڑی بندیا۔ مانگ میں

سیندور اور عنابی بنارسی ساڑی میں۔ہونٹ غصے میں بھینچے ہوئے۔آنکھوں میں حقارت۔میں شرمندہ ہونے لگا.....نرملا گرم کی نظروں کی تاب نہ لاکر آنکھیں کس کے بند کرلیں.....صبح جلدی سے ہوجائے اور میں اپنی چھت پر جاؤں۔ بوگن ویلیا کی گلابی پنکھڑیوں سے آنکھ مچولی کھیلوں۔اپنے پودھوں کے گلے شکوے دور کروں!! صبح اندھیرے ہی ایک عجیب سے شور نے مجھے بیدار کردیا۔میں نے دھول سے اٹی گھڑی میں وقت دیکھنے کی کوشش کی۔آنکھیں مل کر دیکھا۔شاید پانچ بجے تھے۔گھٹی گھٹی نرم چیخ سن کر میں اپنی شرٹ ڈھونڈھتا ہوا بستر سے کودا اور چھت کی طرف دوڑا۔سویرے کی ہلکی دھند کی تہہ میں دیوار کے پار.....

مسز احمد اور احمد صاحب ایک دوسرے میں الجھے ہوئے تھے۔احمد صاحب صرف نیلے چوخانے تہبند میں اور مسز احمد پہلی بار بغیر دوشالے کے میری نیند سے بوجھل آنکھیں اور پھولی ہوئی سانس دونوں جم گئے۔مسز احمد کا سنہرا جوڑا احمد صاحب کی مٹھی میں کانپ رہا تھا۔مسز احمد کے ہاتھ سے پودھوں میں پانی کی دھار دیتا ربڑ کا پائپ چھوٹ گیا۔مسز احمد کی حریری ہتھیلیاں لرزنے لگیں اور احمد صاحب کی کھچڑی داڑھی کے سامنے جڑ گئیں۔وہ کمر کے بل جھکی جارہی تھیں۔درد کی کرب ناک لہریں انکے سرخ چہرے سے دوڑ کر میرے دل پر شگاف ڈالنے لگیں۔انکی سنہری پلکیں اب تک انکی آنکھوں پر ڈھکی تھیں۔اسی کشاکش میں سنہری جوڑا بکھر گیا۔

میرے دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکن ڈوب گئی۔احمد صاحب نے انکی کانپتی حریری ہتھیلیاں چیتے کی سی پھرتی سے اپنے قبضے میں کرلیں۔دیوار پر چڑھ نے کے لئے میں بوگن ویلیا کے بڑے گملے پر کھڑا ہو گیا۔بلوریں کلائیاں احمد صاحب نے ایک جھٹکے سے جھنجھوڑ دیں۔بلوریں کلائیوں پر ضرب۔میرے دل میں چھن چھن کرکے انکی شیشے کی نازک کلائیاں چرمرائیں۔احمد صاحب نے فرش پر پڑا پانی سے بھرا ربڑ کا موٹا پائپ اٹھالیا۔میں نے کس کے دیوار کو جکڑ لیا۔اور ایک قدم دیوار پر جمانے کی کوشش کرنے لگا۔پائپ سے ابلتی پانی کی تیز دھار انکی بے داغ چاند پیشانی پر.....انکی شفاف گردن پر.....اور انکے چمکتے سونا بکھیرتے بالوں پر.....اور.....انکی نارنجی قمیص کے بند گریبان پر.....وہ گنگا جل سے دھلی دھلائی.....پوتر دیوی۔میں بے دل.....بے جان.....بے اختیار.....

دیوار پر چڑھنے لگا.....وہ پانی کی دھار سے بوکھلائی ادھر ادھر بچنے لگیں۔سڑاسڑ کی آوازیں میرے دماغ کو ماؤف کرنے لگیں۔میں دیوار پر آدھا لٹک کر انکی طرف کودنے کو تیار ہوا.....ہچکیوں کی لڑیوں نے انکے بھرے بھرے وجود میں ارتعاش پیدا کردیا۔وہ احمد صاحب کے قدموں میں جھکنے لگیں۔انکی حریری ہتھیلیاں اب بھی جڑی ہوئی تھیں۔بھاری پائپ کے بوجھ سے احمد صاحب ہانپ گئے۔وہ پائپ کو بھیگی ہوئی مسز احمد کے اوپر پھینک کر کمرے میں کوچ کر گئے۔سرخ چہرہ۔بھیگی مسز احمد اچک کر میں نے ایک پیر دیوار پر رکھا میرا ایک پیر اب بھی لٹک رہا تھا۔سنہری پلکوں کی جھالر میری جانب اٹھی۔ہرے سمندر کناروں سے ابل پڑے۔ ہرے سمندروں میں سنامی آچکا تھا۔آنسوؤں سے لبریز انکی سبز پتلیاں مجھے دیکھ رہی تھیں۔انکی آپس میں جڑی ہتھیلیاں اب میری طرف اٹھنے لگیں۔ایک پیر دیوار پر اور دوسرا لٹکا ہوا۔ میں ہرے سمندروں میں ڈوب گیا۔نوخیز صبح کے ماتھے پر سورج کی سیندوری لالی بکھر گئی۔سہمی سہمی شبنمی مسز احمد .....بند گلابی ہونٹوں میں مسکرا دیں..... بلوریں نازک ہتھیلیاں ایک دوسرے سے جدا ہوئیں اور ابلتے ہرے ہرے سمندروں پر بادبان بن گئیں!!!

وہ اپنی آنکھیں اپنی ہتھیلیوں سے ڈھانپے شرم سے مسکرائے جارہی تھیں۔بوگن ویلیا کے پھولوں کے گچھے مہک اٹھے۔میرے پودھوں میں کھلے سرخ گلاب،موگرے اور چمیلی کے پھول سر اٹھا کر میرے ساتھ دیوار کے پار تاکنے لگے۔میں کسی آزردہ وجود کے مسکرانے کی خوبصورت وجہ بن سکا!! وہ مقدس دیوی۔میرے دل کے کھلتے کنول کی پھیلی پتیوں پر براجمان تھیں۔آج .....زندگی میں پہلی بار.....مجھے اپنا بیکار وجود بھاری بھرکم لگنے لگا۔میں دھم سے اپنی ٹھنڈی چھت پر گر پڑا۔ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں اپنے بیڈروم کی طرف دوڑ گیا۔چرمی بیگ کی اندرونی جیب سے اپنا پاسپورٹ نکالا۔دس سال کے ملٹی پل یو ایس ویزا کی اسٹیمپ لگے صفحے کو پاسپورٹ سے ایک جھٹکے میں الگ کردیا۔اور.....اس صفحے کے ان گنت ننھے ننھے پرزے کردئے اور.....ننھے ننھے پرزوں کو اپنی ہتھیلی پر رکھا اور ..... ایک زوردار پھونک مار کر.....کھڑکی کے باہر کھلی فضا میں اڑادیا۔

❑❑❑

یہ تو میں نے سوچا نہ تھا

ندیم راعی
198، چودھری ہاؤس، مراد آباد
موبائل: 8188937127

ممبئی کے اندھیری اسٹیشن کے پل کی بالکنی کے ایک کونے میں ایک لڑکی کسی سے روتے ہوئے موبائل پر کہہ رہی تھی۔ ''یہ تو میں نے سوچا نہ تھا۔'' اب اسے کوئی بتائے کہ پیار سوچ سمجھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ ہوجاتا ہے۔ پیار نہ عمر دیکھتا ہے نہ ذات نہ پات نہ امیر غریب اور نہ ہی اچھا برا۔ وہ تو بس خود بخود ہوجاتا ہے اور وہ بھی کسی کی ایک ادا کسی کی ایک ''حرکت'' جو متاثر کر جاتی ہے اور مکمل زندگی اس کے حصار میں چلی جاتی ہے۔ نہ خود وہ اپنے بس میں رہتا ہے اور نہ اس کا وجود دل و دماغ یہاں تک کہ اس کی جان بھی اس کی نہیں رہتی۔

اپنی چال کے برابر والی چال کی رہنے والی سلونی کی بارات شیواجی مینکٹ ہال میں اپنے روایتی انداز سے آچکی تھی۔ شادی کی دیگر رسومات کے علاوہ جوتا چرائی کی رسم کے لئے دولہا کی سالیاں قطار میں تھیں جن کی سربراہی کے فرائض انیتا انجام دے رہی تھی۔ چونکہ سلونی کی کوئی سگی بہن نہیں تھی دور دراز شہروں سے آئی ہوئی دلہن کی کزنس یہاں کے لب ولہجے و ریتی رواج سے ناواقف تھیں لہٰذا سالی کے فرض کی انجام دہی انیتا کو کرنی پڑی۔ ان دو تین دنوں میں ہی یہ مراٹھی لڑکی ان بہاری لڑکیوں سے گھل مل گئی تھی۔ جوتا چرانے کی رسم تو سماج کے ہر فرقے اور صوبے میں موجود تھی۔ اور اسے ہندی فلموں نے مزید تقویت عطا کر دی تھی لہٰذا اب ہر شادی میں جوتا چرائی کی دھوم رہتی ہے۔

انیتا کا ایک دس سالہ چھوٹا بھائی امر جو بے حد شرارتی اور حد درجہ چالاک تھا کو دولہا کے شادی ہال میں داخل ہوتے ہی اس کے جوتے اٹھا لانے کا کام سونپا گیا تھا دولہا جیسے ہی اپنے جوتے اتار کر بے خیالی اور لاپرواہی کے ساتھ تخت پر بچھی قالین پر گئو تکیہ سے لگ کر بیٹھا۔ امر نے بڑی چالاکی اور پھرتی سے اس کے جوتے اٹھا کر انیتا کے سپرد کر دئے اب ان جوتوں

انیتا اور بابو کے درمیان موبائل پر سلسلۂ گفتگو شروع ہوگیا تھا۔ انیتا ایک مال میں سیلس گرل اور بابو ریلوے اسٹیشن پر بکنگ کلرک تھا۔ یہ دونوں فرصت کے لمحات میں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ ملاقاتوں کے درمیان عہد و پیمان بھی ہونے لگے۔ ایک نے دوسرے پر اظہار محبت بھی کر دیا تھا۔ دونوں کی زندگی میں خوشیوں کا راج تھا دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر رہنا محال تھا۔ اٹھائیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس کو کسی کی ادا نہیں بھائی تھی کسی سے پیار بھی نہیں ہوا تھا۔ اچانک وہ بابو کے پیار میں کس طرح اور کیوں مبتلا ہوگئی اسے پتہ بھی نہیں چلا۔

کی واپسی کے لئے ایک موٹی رقم کا مطالبہ کیا گیا اور تہہ توڑ کا دور شروع ہوگیا دولہا کے دوست واحباب بھی کسی سے کم نہیں تھے ایک سے بڑھ کر ایک گبرو جوان ہنڈسم اور نئی طرز کے پیراہن زیب تن کئے لڑکے اور لڑکیوں کی تکرار طول پکڑنے لگی تھی۔

آخر کار طے پایا کہ دلہن کی جانب سے ایک لڑکی انیتا اور دولہا کی جانب سے ایک لڑکا بابو یہ دونوں الگ جا کر آپس میں جو رقم جوتا واپسی کی طے کریں گے اسے دونوں طرف کے لوگ خوش دلی سے مان لیں گے۔ لہٰذا دونوں کو ایک جانب بھیج دیا گیا اور جو رقم ان دونوں نے طے کی وہ دولہا نے اپنی سالیوں کو ادا کر دی۔

انیتا اور بابو کے درمیان موبائل پر سلسلۂ گفتگو شروع ہوگیا تھا۔ انیتا ایک مال میں سیلس گرل اور بابو ریلوے اسٹیشن پر بکنگ کلرک تھا۔ یہ دونوں فرصت کے لمحات میں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ ملاقاتوں کے درمیان عہد و پیمان بھی ہونے لگے۔ ایک نے دوسرے پر اظہار محبت بھی کر دیا تھا۔ دونوں کی زندگی میں خوشیوں کا راج تھا دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر رہنا محال تھا۔

اٹھائیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس کو کسی کی ادا نہیں بھائی تھی کسی سے پیار بھی نہیں ہوا تھا۔ اچانک وہ بابو کے پیار میں کس طرح اور کیوں مبتلا ہوگئی اسے پتہ بھی نہیں چلا۔

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اور ان کے عشق کا علم دونوں کے والدین کو ہوگیا تھا۔ جو کسی بھی حالت میں ایک دوسرے سے منسوب نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک مراٹھی اور دوسرا بہاری۔ لیکن انیتا پوری طرح بغاوت پر آمادہ تھی اس سلسلے میں بابو معتدل مزاج رکھتا تھا۔

اس نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے انیتا کو

سمجھایا کہ وہ اپنے والدین کو تھوڑا وقت دے اور اسے بھی.....تاکہ پیار سے بات چیت کے ذریعہ مسئلہ حل ہو جائے۔ بابو یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ انیتا کے والدین کی مرضی کے بغیر اس سے شادی کرے اس کے سامنے مراٹھی اور بہاری کے بیچ دراڑ تھی جسے پاٹنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا لہٰذا اس نے آہستہ آہستہ انیتا سے دوری بنانا شروع کر دی سب سے پہلے تو اس نے اپنا ٹرانسفر شولہ پور اسٹیشن کرالیا۔ لیکن انیتا کسی بھی صورت میں پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی اب وہ فون کے ذریعہ بابو پر زور ڈال رہی تھی کہ ہم دونوں چھپ کر شادی کر لیں اور شولہ پور آ کر اس کے ساتھ رہنے لگیں۔ لیکن بابو تیار نہیں تھا۔

اب بابو نے انیتا کی فون کال ریسو کرنا بند کر دی تھی بلکہ اس کا نمبر بلیک لسٹ میں ڈال دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود ہی اسے فون کر لیا کرتا اور فون رسیو نہ کرنے کی شکایت پر وہ نیٹ ورک کے خراب ہونے کا بہانہ بناتا۔

ممبئی آنے پر بھی وہ صرف اپنی فیملی سے مل کر واپس چلا جاتا انیتا سے ملنا نظر انداز کر دیتا۔ جیسے جیسے دن گذرتے گئے مراٹھی و بہاریوں کے بیچ خلاء بڑھتا رہا اس کے باوجود انیتا بابو کے پیار میں دیوانگی کی حدوں کو پار کر کے اس تک شولہ پور آ پہنچی اس نے بہ مشکل تمام سمجھا بجھا کر اسے اس کے ماں باپ کے پاس بھیجا۔

بابو صبح سویرے دفتر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا وہ یہاں اکیلا کسی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا کہ ایک پولس والے نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اسے اپنے ساتھ لے جا کر حوالات میں بند کر دیا جس کی چارج شیٹ سے پتہ چلا کہ اس پر ممبئی کی کسی انیتا نام کی لڑکی کو شادی کا جھانسہ دے کر اس کے ساتھ بلاتکار کرنے کا الزام تھا۔ جسے مجسٹریٹ نے فوراً جیل بھیج دیا۔

بابو کے رشتہ داروں کی لاکھ کوششوں کے باوجود اور پھر بہاری ہونے کے ناطے اسے ضمانت نہیں مل پائی۔ وہاں کے مراٹھیوں میں غم و غصہ پایا گیا اور کئی بار ضمانتیوں کو انیتا کے رشتہ داروں نے کچہری سے کھدیڑنے کی کوشش کی اور فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہوتے بچا۔

بلاتکار کے مقدمے کی سماعت شروع ہو گئی لیکن

پیشی کے درمیان انیتا ندارد رہتی اس کا پتا پیشی پر حاضر ہوتا۔ بابو انیتا سے مل کر پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے تو اسے کبھی چھوا تک نہیں یہ بلاتکار کا جھوٹا مقدمہ اس کے خلاف کیوں اس نے دائر کر دیا۔

آخر اس نے اپنے ایک دوست نرائن تیواری کو سارا حال سنایا جس کی شادی میں انیتا سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ بابو نے اسے یہ بھی بتایا کہ انیتا اس سے چھپ کر شادی کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس کے لئے راضی نہیں تھا کہ کہیں مراٹھی و بہاریوں کے بیچ اور تنازعہ نہ بڑھ جائے...؟

نرائن تیواری نے انیتا کو اپنی سسرال میں بلا کر بابو پر یہ جھوٹا مقدمہ دائر کرنے کی بابت معلومات فراہم کیں۔

وہ بابو سے پیار کرتی تھی اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھی بابو بھی اس سے پیار کرتا تھا لیکن دونوں کی شادی میں انیتا کے والدین حائل تھے جبکہ انیتا گھر سے بغاوت کر کے اس سے شادی کرنے پر بضد تھی۔

پھر بابو نے اس سے ملنا جلنا کم کر دیا یہاں تک کہ اس نے اس کا فون نمبر بلیک لسٹ میں ڈال دیا لیکن یہ سوچ کر وہ اپنا دکھ کم کر لیتی کہ صحیح وقت آنے پر وہ اس سے ضرور شادی کرے گا۔ لیکن وہ جھوٹا، دھوکے باز اور بے وفا نکلا وہ اس کے جذبات سے کھیل رہا تھا۔

وہ اپنی نئی معشوقہ کے ساتھ عشق لڑانے میں محو تھا اس کے ساتھ اس نے کئی بار اسے ممبئی کی مختلف جگہوں پر دیکھا اور جب اس نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ایک تو یہ کہ اس نے بہاری ہو کر ایک مراٹھی لڑکی کو دھوکہ دینے کی جرأت کی جب کہ وہ اس کے لئے اپنے پورے خاندان سے لڑ گئی۔

انیتا اس کی بے وفائی برداشت نہیں کر پائی اور سزا دینے کی ٹھان لی یہ مقدمہ اس کو سزا دینے کا پہلا قدم ہے۔

نرائن نے انیتا کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ دھوکہ باز اور بے وفا نہیں ہے۔ وہ لڑکی جس کو تم نے بار بار اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کی کزن ہے اور الموڑہ سے ممبئی گھومنے آئی تھی۔

❑❑❑

شجاع الدولہ کا میر قاسم علیجاہ والیٔ بنگالہ کا مددگار ہوکر انگریزون پر چڑھائی کرنا

محمد نجم الغنی خاں رامپوری

دسمبر ۲۰۱۷ء کے شمارے میں اردو حروف تہجی سے متعلق اداریہ اور دیگر مضامین کی اشاعت پر ردِعمل کا خیر مقدم۔ اس سلسلہ میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کے تاثرات اور محمد نجم الغنی خاں کی کتاب 'تاریخ اودھ' سن اشاعت ۱۹۱۹ء کے اقتباس کا متن من وعن بطور خاص شائع کیا جا رہا ہے تاکہ اس بات کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکے کہ ہر عہد میں اردو کا روپ جداگانہ رہا ہے۔ (ایڈیٹر)

جبکہ اواخر ۱۱۷۶ھ مین انگریزون اور نواب قاسم علی خان عالیجاہ والی بنگالہ مین کدورت پیدا ہوگئی اور لڑائیون مین اس کو پے در پے شکستین دیکر ۱۱۷۷ ہجری مین انگریزون نے عظیم آباد کو فتح کرلیا۔ اور میر قاسم عالیجاہ کی جگہ میر جعفر خان کو مسند نشین کیا تو میر قاسم عالیجاہ نے شجاع الدولہ سے مدد حاصل کرنے کا ارادہ کیا جب اسنے اپنے سردارون سے اس بارے مین مشورہ کیا تو مرزا نجف خان نے جو شجاع الدولہ کے مزاج اور رویہ سے واقف تھا اُنکے پاس جانے کی صلاح نہ دی اور کہا کہ اُدھر نہ جایئے بلکہ خود بدولت مع متعلقین کے قلعہ رہتاس مین رہیے اور انگریزون کی مہم مرے سپرد کیجیے کہ فوج منتخب کے انگریزون سے جنگ کرون اور انکو آرام وفرصت کی مجال نہ دون عالیجاہ نے آب وہوائے رہتاس کی ناموافقت اور دوسرے وجوہ سے اس مشورے کو ناپسند کیا مرزا نجف خان نے کہا کہ اگر کسی سے مدد لینا منظور ہے تو برہ بند یلکھنڈ عازم دکن ہو جیے اور مرہٹون سے مدد طلب کیجیے عالیجاہ دوری راہ اور اپنی اجنبیت اور انکی بدمزاجی اور لٹیرے پن کی وجہ سے اس مشورے پر بھی رضامند نہوا بادشاہ اور شجاع الدولہ سے رجوع بہتر سمجھا۔ ایک دن صبح کو ڈیڑھ لاکھ روپے نقد اور پانچ ہاتھی مرزا نجف خان کو جو شجاع الدولہ کے پاس جانے پر راضی نہ تھا دیکر رخصت کیا اور خود انگریزون کے تعاقب کے خوف سے دریاے کرم ناسہ پر منزل گزین ہوا۔ شجاع الدولہ ان دنون بندیلکھنڈ کے بندوبست میں سرگرم تھے کہ میر قاسم نے میر سلیمان کو برسم رسالت انکے پاس بھیجا اُسنے یہان آکر راجہ بینی بہادر اور علی بیگ خان اور مرزا بہلول سے جو ایام طفلی سے وزیر کا اتالیق تھا مع دیگر عملہ ارکان دولت کے ربط پیدا کیا اور ان کو بہت کچھ مال دے کر وسیلہ مستحکم کرکے دلجوئی کی تحریر لیکر عالیجاہ کے پاس واپس ہوا اور اس کے پہونچنے کے قبل مرزا شمس الدین بھی وزیر کی تحریر جو نہایت عطوفت اور استمالت کے ساتھ تھی اور آسمین قرآن کی قسم بھی تھی لیگیا تھا۔ چونکہ بادشاہ اور شجاع الدولہ الہ آباد مین بندیلکھنڈ کے انتظام مین مصروف تھے۔ عالیجاہ بھی حسب الطلب اُدھر ہی کو روانہ ہوا۔ جبکہ عالیجاہ وزیر کے لشکر کے قریب ایسے مقام پر پہونچا کہ تین کوس کا فاصلہ تھا تو شجاع الدولہ دس بارہ ہزار سوار لے کر استقبال کو گئے عالیجاہ کو جبکہ وزیر کے آنے کا حال معلوم ہوا تو اپنی پلٹنون کو آراستہ کرکے سراپردے کے دروازے سے دور تک دورویہ کھڑا کیا۔ اور ایک عالیشان خیمہ استادہ کرایا۔ عالیجاہ کے سردار اور عمائد بھی عمدہ لباس پہن کر حاضر تھے جب وزیر پہونچنے تو دروازے تک استقبال کیا۔ حسب ضابطۂ ہندوستان سلام ہوا۔ باہم معانقہ کیا اور ایک مسند پر بیٹھے۔ شجاع الدولہ نے عالیجاہ کو بہت تسلی دی اور کہا کہ مین اپنے ہمراہ لیجا کر آپ کا سلام بادشاہ سے

'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر' ۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان وشوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کملانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہوگیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نبرد آزما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'

اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی وتہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی نویں کڑی کے طور پر محمد نجم الغنی خاں کی کتاب 'تاریخ اودھ' سے ایک تحریر **'شجاع الدولہ کا میر قاسم علیجاہ والی بنگالہ کا مددگار ہوکر انگریزون پر چڑھائی کرنا'** حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

کراؤن گا۔ عالیجاہ نے عمدہ قسم کے کپڑون کی اکیس کشتیان اور بہت سارے جواہر اور ہاتھی بطور تحفے کے دیے۔ پھر وزیر اپنے ہمراہ بادشاہ کی ملازمت کے لیے عالیجاہ کو لیگئے اور خاص اپنے ہاتھی پر اپنے ساتھ بٹھایا بادشاہ کی ملازمت سے مستفید ہوکر دونون نواب اپنے اپنے لشکرون مین چلے گئے۔ دوسرے روز عالیجاہ وزیر کی بازدید کو روانہ ہوا انہوں نے بھی مغلیہ ملازمون کو حکم دیا تھا کہ باناتی لباس پہنکر اور بندوقین ہاتھ مین لےکر دستہ دستہ سر دروازہ سے لیکر جہان تک گنجائش ہو کھڑے ہون۔ حسب الحکم تعمیل ہوئی اور ارکان دولت بھی اپنی اپنی خدمت پر حاضر تھے۔ جب عالیجاہ سرا پردۂ وزیر مین داخل ہوا وزیر نے لبِ فرش تک استقبال کیا اور عالیجاہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی مسند پر برابر بٹھایا۔ اور نہایت اشفاق کے ساتھ فرمایا کہ صوبجات بنگالہ اور عظیم آباد انگریزون کے ہاتھ سے نکال کر تمہارے حوالے کرون گا۔

وزیر کو توقع تھی کہ عالیجاہ کی امداد کے بہانے سے وہ خود بنگالے پر قابض ہو جائینگے۔ چند روز مین عالیجاہ نے علی ابراہیم خان کی معرفت کنگن کی ایک جوڑی جو لاکھون روپے کی قیمت رکھتی تھی شجاع الدولہ کی مان کے پاس بھیجی اور اسکو اپنی مان بنایا۔ شجاع الدولہ کو بندیلکھنڈ کے معاملے کا تصفیہ مدنظر تھا اور بعض پرگنات الہ آباد کی تحصیل مالگذاری منظور تھی۔ راجہ بینی بہادر کو پیشتر بھیجکر منتظر حصول مراد تھے مگر بندیلے مطیع نہوتے تھے، اسلئے زیادہ عرصے تک اس طرف رہنے کا خیال تھا اور عالیجاہ کو بنگالے کی طرف وزیر کے کوچ کرنے کی جلدی تھی وہ چاہتا تھا کہ انگریزون کو قدم جما لینے کی فرصت نہ ملے جب میر قاسم نے وزیر کو جلد ادھر سے کوچ کرنے کی خواہش کی تو انھون نے یہی عذر بیان کیا۔ عالیجاہ نے کہا کہ اگر صرف اسیوجہ سے انتظار ہے تو مجھے فرمایئے مین جاکر بندیلون کو مسخر کرلون گا وزیر نے قبول کرکے رخصت فرمایا۔ عالیجاہ جمنا اُتر کر ملک بندیلکھنڈ میں داخل ہوا اُسکا تو پخانہ انگریزی طرز پر تھا اور فوج قواعدان ہمراہ تھی بینی بہادر سے پیشتر پہنچکر ایک قلعہ فتح کرلیا اور ایک دوسرے مضبوط قلعہ کے پاس جا پہونچا۔ بندیلون نے عالیجاہ کی فوج کی ترتیب

> اردو رسم خط میں اصلاح و ترمیم کی کوششیں انفرادی طور پر بھی کی جاتی رہی ہیں اور اجتماعی طور پر بھی۔ انفرادی کوششوں کا ذکر جعفر حسن (حیدرآباد) اور مسعود حسین خاں کے حوالے سے کیا جا چکا ہے۔ اجتماعی کوششوں کے ضمن میں مرکزی حکومت کے قائم کردہ ترقی اردو بورڈ (اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) کی املا کمیٹی کی سفارشات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان سفارشات کو 'املا نامہ' کے نام سے مرتب کرکے گوپی چند نارنگ نے چالیس سال پہلے شائع کر دیا تھا لیکن تاحال ان سفارشات پر پورے طور پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ آج بھی اردو بولنے والوں کی اکثریت ادنیٰ اور اعلیٰ کو ادنا اور اعلا ہی لکھتی ہے نہ کہ ادنا اور اعلا۔ حیرت کی بات ہے کہ انگریزی جو ایک معیاری زبان ہے اس میں بھی ایک آواز کے لئے کئی کئی حروف پائے جاتے ہیں۔ 'ک' کی آواز کیلئے K,C,Ch,Q موجود ہے۔ اسی طرح 'ش' کی آواز کے لئے Sh,Ch,Ti کے حروف مستعمل ہیں۔ علاوہ ازیں 'ز' کی آواز Z سے بھی ادا کی جاتی ہے اور S سے بھی۔ تو پھر برق بیچارے اردو رسم خط پر ہی کیوں گرتی ہے۔
>
> **پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ**
> (بروک فیلڈ، سی ٹی، امریکہ)

ہندوستانی فوجون کے خلاف دیکھی اسلیے زرواجبی کے ادا کرنے پر راضی ہوے اور مرزا نجف خان کے ذریعہ سے جو کرم ناسہ کے مقام سے رخصت ہوکر راجہ بندیلہ کے پاس چلا گیا تھا، معاملہ کا تصفیہ ہوگیا اور حصول زرِ خراج سے اطمینان حاصل ہوا۔ عالیجاہ اس مہم سے فرصت پاکر لشکر وزیر سے ملحق ہوا۔ اب سفر ترقی کا ارادہ مصمم ہوا۔ شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خان کو اس مضمون کا خط لکھا کہ ان دنون انگریزوں نے قاسم علیخان صوبہ دار بنگالہ کو شکست دیکر اسکے تمام ملک پر قبضہ کرلیا ہے اور قاسم علیخان امداد کی امدی پر ہمارے پاس آیا ہے چونکہ ہمارا آپ کا معاملہ واحد ہے اسلیے آپ ایک عمدہ فوج ہماری کمک کے لیے بھیجین جب کئی خط اس مضمون کے گئے تو حافظ صاحب نے عنایت خان کو چھ ہزار فوج کے ساتھ جیسا کہ گلستان رحمت میں مذکور ہے اور بقول مؤلف سیر المتاخرین تین ہزار فوج کے ساتھ اور عماد السعادت کی روایت کے مطابق پانچہزار سپاہ کے ساتھ روانہ کیا اور تنقیح الاخبار کے مؤلف نے غلطی سے یہ لکھدیا ہے کہ چونکہ عنایت خان دو تین ہزار سوار اور اسی قدر پیادون کے ساتھ اپنے باپ سے روٹھ کر شجاع الدولہ کے پاس پہلے سے چلا گیا تھا اسلیے وہ بھی شجاع الدولہ کا شریک ہوا۔ شجاع الدولہ ابھی تک الہ آباد میں تھے جب عنایت خان الہ آباد کے قری پہونچا تو شجاع الدولہ نے راجہ بینی بہادر کو استقبال کے لیے بھیجا اور خود بھی سوار ہوکر دو کوس پر پیشوائی کی اور عنایت خان کو اپنے ہمراہ الہ آباد کو لیگئے۔ دوسرے روز تمام فوجین بنارس کیطرف چلین۔ سیر المتاخرین کا مصنف کہتا ہے کہ شجاع الدولہ کے ساتھ آدمیون کا اتنا ہجوم تھا کہ جہان تک نظر کام کرتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے مگر افسرون کی بےخبری اور ربط وضبط نہونے کی وجہ سے بڑی ابتری تھی۔ عین لشکر مین ایک دوسرے کو قتل کرتا اور اسباب لوٹ لیتا تھا کوئی کسی کا خبر گیر نہ تھا اور جو کوئی ذرا بھی لشکر سے الگ ہوتا تو وہ لٹ جاتا بلکہ جان سے بھی جاتا۔ شجاع الدولہ کے ساتھ اسوقت ہمت گر اور امراؤ گر دونون کا ہونا گل رحمت سے معلوم ہوتا ہے حالانکہ ۱۱۷۶ھ مین امراؤ گر شجاع الدولہ کی ایک آشنا طوائف کو لے بھاگا تھا۔ پھر نہین معلوم کس تقریب سے

نواب نے اسکا قصور معاف کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ راستے مین عنایت خان کی فوج سے ایک پٹھان نے گاے ذبح کی اور اسکو اپنے ڈیرے پر لیے جاتا تھا شجاع الدولہ کی فوج کے نانگون نے اس پٹھان پر حملہ کیا اُسکا گھوڑا زخمی ہوا۔ یہ خبر سنکر دوسرے پٹھان مدد کو پہونچ گئے اور اس پٹھان کو بچالیا۔ عنایت خانے اپنی فوج کے پٹھانون کو حکم دیا کہ نانگے کو جہان پاؤ مار ڈالو چنانچہ دوسرے روز صبح پٹھانون کا ایک گانوٗن پر گزر ہوا جسکو تین سو نانگے محاصرہ کیے ہوئے لوٹ رہے تھے پٹھان اُن نانگون کے قتل پر پل پڑے نانگے بھی مقابلہ کرنے لگے اور آخرکار مغلوب ہوکر بھاگ نکلے اس موقع پر اڑھائی سو نانگے کام آئے پٹھانون کی طرف سے صرف دو آدمی مارے گئے جیسا کہ گل رحمت مین مذکور ہے اور اخبار حسن مین کہا ہے کہ پچاس پٹھان مارے گئے تھے اور بارہ مجروح ہوے۔ جب اس واقعہ کی خبر راجہ بینی بہادر کو ہوئی جو شجاع الدولہ کے لشکر کا مدار المہام تھا تو وہ اسیوقت سوار ہوکر عنایت خان کے ڈیرے پر آیا اور معذرت کرنے لگا دوسرے روز شجاع الدولہ ہمت گر اور کو جو گوشائیون اور نانگون کے سردار تھے اپنے ہمراہ لے کر عنایت خان کے ڈیرے پر گئے اور صفائی کرادی اور یہ قرار پایا کہ آئندہ سے نانگے پٹھانون کے لشکر سے ایک منزل پیچھے رہین۔ نانگا گوشائیون کا فرقہ ہے جو برہنہ رہتے ہین یہانتک کہ ستر عورت بھی نہین کرتے اسی لئے نانگا کہلاتے ہین اور اپنی جانون کو فقراے ہنود مین شمار کرتے ہین اور سپاہگری کا پیشہ کرتے ہین۔ بارہ ہزار نانگے شجاع الدولہ کے لشکر مین قزاقی کے لیے جمع تھے۔

ماہ رمضان ۱۱۷۷ھ کے وسط مین شجاع الدولہ اور شاہ عالم بادشاہ اور میر قاسم علی عالیجاہ مین داخل ہوے اس مقام مین رجہ بلونت سنگھ زمیندار بنارس کا سفیر عنایت خان کے پاس آیا اور ظاہر کیا کہ راجہ بلونت سنگھ نے کبھی صفدر جنگ اور شجاع الدولہ سے ملاقات نہین کی تھی مگر زر خراج ہمیشہ بھیجتا رہتا تھا اب اُسکی استدعا ہے کہ نواب شجاع الدولہ مدت سے یہ چاہتے تھے کہ راجہ بنارس میرے دربار مین حاضر ہو اس لیے انھون نے بخوبی اطمینان کر دیا اور راجہ کی حاضری کی اجازت دی بلونت سنگھ عنایت خان اور بینی بہادر کے اعتماد پر جسکا متوسط سید نور الحسن بلگرامی ہوا تھا شجاع الدولہ کے پاس حاضر ہو گیا۔ یہ شخص بڑا مالدار تھا لوگ اسکی دولت کو کروڑون سے متجاوز بتاتے تھے۔ یہ بھی دو تین ہزار پیادہ وسوار کے ساتھ شجاع الدولہ کے ہمراہ ہوا۔ یہ شخص ہمیشہ نواب شجاع الدولہ کو خراج ادا کرتا تھا مگر جسوقت سرکار وزیر سے خود اُسکی طلبی ہوتی تو کہتا تھا کہ جناب عالی خدا کے برابر ہین جو کوئی خدا کے پاس جاتا ہے وہ واپس نہین آتا وجہ اسکی یہ تھی کہ پرتھی پت زمیندار پرتاپگڈھ صفدر جنگ کے حکم سے مارا گیا تھا۔ بنارس مین بلدۂ رام نگر کی بنیاد اسی بلونت سنگھ نے قائم کی ہے اور قلعۂ بجے گڈھ مین جو نہایت دشوار گزار پہاڑ پر تھا اپنا خزانہ رکھتا تھا۔ میر قاسم نے اقرار کیا کہ گیارہ لاکھ روپیہ ماہوار اسوقت سے کہ وزیر گنگا سے پار اترینگے اسوقت تک کہ ممالک شرقیہ پر قبضہ پاؤنگا دونگا اب انگریزون اور بادشاہ اور وزیر کے درمیان مین جو پیغام و سلام رہ رہے تھے انسے معلوم ہوتا تھا کہ میر قاسم انگریزون کے حوالے کیا جائیگا یا بالکل دولت اور سپاہ سے محروم ہو جائیگا مگر جب انگریزون کو اس امید کے پورے ہونے کی آس نہ رہی تو میجر کارنگ کو حکم ہوا کہ کرم ناسہ پر دشمنوں کو جا کر روکے اور دریا سے اترنے نہ دے۔ مگر اسوقت کمپنی کی سپاہ کا یہ حال تھا کہ اسکی خدمت گزاری پر کچھ اعتبار نہ تھا ان مین بغاوت کی بو آتی تھی اُن مین سے سپاہی بھاگ بھاگ کر دشمنون سے جا کر ملتے تھے اس آتش بغاوت کے مشتعل ہونے کا سبب یہ تھا کہ موشیر لاک ایک فرانسیسی جماعت سمیت انگریزون کی رفاقت ملازمت مین تھا۔ میر جعفر نے میر قاسم سے لڑنے کے لیے اُنسے وعدۂ انعام کیا تھا اسنے بعد فتح کے انعام کا زر موعود نہ دیا اسپر موشیر لاک کا کچھ انگریزون سے بگاڑ ہو گیا وہ اپنے سو سوا سو آدمین کو لیکر انگریزون سے جدا ہو گیا۔ اور وزیر کے پاس پہونچکر ان کا نوکر ہو گیا۔ انگریزی لشکر کی ایسی ہوا بگڑی کہ ہندوستانی سپاہیون نے بھی لڑائیون مین سخت محنت کرنے اور شجاعت دکھانے کا انعام مانگا کچھ روپیہ انکو دیا گیا اس سے کچھ سپاہ کی ناراضی کم ہوئی غرض ایک طرف یہ ناراضی سپاہ کی تھی اور دوسری طرف غلے کی قلت تھی۔ میر جعفر کی مرضی لڑائی کی نہ تھی یہ سب باتین ایسی جمع ہو گئی تھین کہ انگریزون نے آگے بڑھکر دشمن سے لڑنے کا ارادہ چھوڑ دیا اور لشکر آگے بڑھ کر پٹنے مین الٹا چلا گیا اور یہان اپنی حفاظت کے لیے لڑنے کا ارادہ کیا تینون لشکر یعنی بادشاہ اور وزیر اور عالیجاہ کے کئی سردار شیک علی حزین کی خدمت مین بنارس مین حاضر ہوا کرتے تھے شیخ کے فحواے کلام سے انگریزون کے ساتھ جنگ کی ممانعت پائی جاتی تھی وجہ اس کی یہ تھی کہ وزیر کی فوج مین نہ انتظام تھا اور نہ تو اعدداں تھی۔ کبھی شیخ کہتے تھے کہ اس جماعت سے کوئی کام انجام کو نہین پہنچے گا منزل گردی کر کے عنقریب لوٹ آئینگے۔ بہرحال دریاے گنگا پر کشتیون کا پل باندھ کر عبور کیا اور تھوڑے سے توقف کے بعد کوچ ہوا۔ لشکر کیا تھا گویا ایک عظیم الشان شہر ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کر رہا تھا۔ جو کچھ دار السلطنت دہلی مین کہ اس وقت مین ہندوستان کا چشم و چراغ تھا میسر تھا وہ اس لشکر مین بھی موجود تھا۔

سیر المتاخرین مین ہے کہ بعض ہوشیار شخصون نے وزیر کو سمجھایا کہ انگریزون سے اس ملک کے قاعدے کے موافق جنگ کرنا موافق نہین کیونکہ جس جگہ یہ لوگ صف باندھکر کھڑے ہو جاتے ہین تو گویا سد سکندر قائم ہو جاتی ہے اگر وہ دس ہزار ہون تو پچاس ہزار انکے مقابلہ مین عہدہ برآ نہین ہو سکتے چنوکہ مدت سے ہلہ اور دھاوا حضور کا معمول ہے اور ملازمان رکاب نے بھی اس فن مین مشق بہم پہونچائی ہے جوانان خوش آمد ید اسپہ معتمد اور سرداران جان فشان منتخب ہمراہ لیجیے

اور عورتون کو مع بہیر اور سامان و اسباب کے اس جگہ چھوڑیے باقی فوج سے گزر کریے اسطرح کہ حضور کی شہرت نہو جریدہ انگریزی فوج پر جو اسوقت گھبرا کر بکسر سے جاتی ہے دھاوا کرنا چاہیے بڑے سویرے قبل اسکے کہ مستعد ہوکر راہی ہون اپنر چڑھائی کرنی چاہیے اگر انکی جمعیت پریشان ہوئی تو فتح حاصل ہوئی ورنہ جو ملین ان کو تباہ کرنا چاہیے اور پس ماندہ اسباب جلا کے اور توپین اور بار برداری کی گاڑیان خراب کر کے تمام روز انکا تعاقب کرنا چاہیے۔ اور رات کو ایسی جگہ مقام کرنا چاہیے جہان شبخون کا اندیشہ نہو اسی طرح قلعہ عظیم آباد تک پیچھا کیے جایئے۔ اگر اس رہروی مین انکا خاتمہ ہوا تو بہتر ہے۔ ورنہ قلعہ سے تعرض نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ سہسرام پہنچ کر مع زبردست فوج کے مقام کیجیے اور کچھ فوج کو نہایت لائق اور بہادر سردارون کی ماتحتی مین مقرر کر کے سارن یا آرہ کے مقامات سے گنگا کو عبور کرا کے اسکو مامور کیجیے اور ہر ضلع میں حکام لائق اور ایماندار مقرر کر کے انکو وہان بھیجیے اور انکو تاکید کر دیجیک کہ رعایا کی دلجوئی کرین کسی کو تکلیف نہ پہونچائین اور محالات کا بندوبست نہایت تخفیف کے ساتھ کرین تاکہ زمینداروں اور رعایا کی تالیف قلوب ہو اور لوگون کو متوحش نہ کر کے تمام قلمرو بنگالہ مین جو بہت دور نہ ہو عمل و دخل کر لینا چاہیے اور ایک فوج عظیم آباد کی طرف بھیج کر اسیطرح ادھر بھی حاکم مقرر کرنا چاہیے اور یہ دونون فوجین دریا کے دونون طرف گشت کرتی رہین تاکہ جو کشتی کلکتے کی طرف سے عظیم آباد کو آئے اور جس طرف سے ملح لیے جاتے ہون اس طرف کی فوج پہونچکر اس کشتی کو لوٹ لے اور رسد عظیم کے قلعہ مین داخل نہ ہونے پائے اس صورت مین انگریزون کو بڑی پریشانی پیدا ہوگی اور بجز کلکتے کو بھاگنے اور قلعۂ عظیم آباد چھوڑنے کے دوسری تدبیر نہ کرسکین گے بعدازاں جو کچھ مناسب ہو عمل فرمایئے گا۔ وزیر برگشتہ تقدیر کو کہ فی الحقیقت نہایت مناسب تھی پسند نہ آئی اور جنگ کے باب مین جو کوئی کچھ صلاح یا تدبیر عرض کرتا اسے ہرگز نہ سنتے چونکہ احمد شاہ ابدالی کی لڑائی دیکھی تھی اپنے آپ کو ان کے مقلدون مین سے جانتے تھے اور جواب دیتے تھے کہ جنگ کو میری رائے اور سلیقے پر چھوڑنا چاہیے۔ نواب کی سپاہ کی جراری کی اسوقت مین شہرت بہت تھی۔ غرضکہ شجاع الدولہ اور بادشاہ اور عالیجاہ حدود عظیم آباد مین داخل ہوکر نہایت خوش وقت منزل بمنزل راشتہ طے کرنے لگے۔ انکے لشکر کے غارتگر لشکر کے آس پاس پانچ پانچ کوس تک آبادی کا نشان باقی نہ رکھتے۔ عامۂ خلائق کو اتنی ایذا پہنچائی کہ بیچارے جسقدر وزیر اور بادشاہ کے ورود سے خوش تھے اسیقدر عاجز ہوکر انگریزون کی فتح کے لئے دعائین کرنے لگے کیونکہ انگریزون کے ہاتھ سے ایسا ظلم نہیں ہوتا تھا اور کسی شخص کو ضرر نہین پہونچتا تھا۔

سیر المتاخرین کا مؤلف کہتا ہے کہ جب یہ لشکر مکراین مین دریاے سوہن کے کنارے پہنچا بندہ چونکہ مدت سے اپنی والدہ کی ملاقات کا آرزومند تھا چوپالے مین سوار ہوکر دو تین خدمتگار اور اسباب کی گاڑی لے کر حسین آباد کی جانب روانہ ہوا۔ جب دریا سے پار ہوا محمود خان اپنے رفیق کو مع دو تین آدمیون اور بار برداری کے چھوڑ کر آپ آگے کو بڑھ گیا۔ موضع شیخ پورہ مین جہان کے رہنے والے بادشاہ اور وزیر کے لشکر کے خوف سے گاؤن کو خالی کر کے بھاگ گئے تھے پہونچا اژدھام نظر آیا گھوڑون کا ہنہنانا سنکر تعجب ہوا کہ یہان گھوڑے کہان سے آئے آدمی کیونکر رہ گئے ہین اسوقت یاد آیا کہ لشکر کے قطاع الطریق ہین خیر پیشتر کو چلا دو تین کوس راستہ طے کیا تھا کہ گرد و غبار اور آہمین سنان کی چمک نظر آئی زیادہ حیرانی ہوئی۔ بعد اس کے دیکھا کہ ہزارون مویشی اور قریب دو تین سو سوار مغل اور افغان درّانی جو وزیر کے ملازم تھے انکے پیچھے چلے آتے ہین بندے کو اس جنگل مین اپنی اور اپنے رفیق کی جان کی طرف سے اندیشہ پیدا ہوا اسلیے دل مین یہ قرار دیا کہ ابھی دور ہین شاید مجھے نہ دیکھا ہوگا۔ کنارۂ دریا سے اتر کر نیچے کی طرف سے ریگ سوہن مین ہوکر اپنے ملک کو جانا چاہیے۔ کہارون کو حکم دیا یہ لوگ پرانے نوکر تھے ان کے جمعدار نے نہ مانا اور کہا کہ جب ہم نے انھین دیکھا ہے تو انھون نے بھی ہمین ضرور دیکھا ہوگا اس حرکت کو ہماری نامردی پر خیال کر کے زیادہ دلیر ہونگے پس مناسب یہ ہے کہ ان کے درمیان مین دلیری کے ساتھ جایئے بندے نے سمجھا کہ سچ کہتا ہے۔ اسکی صلاح کو پسند کیا۔ جب پاس پہنچ گئے ایک مغل نے صف سے باہر نکل کر نیدون کے توڑے کو گھوڑے پر رکھ کر میری طرف فیر کرنا چاہا اور کہا تو کون ہے اور کہان جاتا ہے بندے نے بھی دلیرانہ جواب دیا کہ تجھکو کیا کام ہے وزیر الممالک نے سید ہدایت علی خان بہادر اسد جنگ کے لانے کے لیے جو دامن قلعہ رہتاس مین رہتا ہے بھیجا ہے وہان جاتا ہون اسنے کہا کہ یہ دوسرا کون ہے مین نے جواب دیا کہ میرا رفیق ہے اور میری بار برداری پیچھے آتی ہے یہ کہکر روانہ ہوا اسنے میرا دلیرانہ جواب سنکر میری بات کو سچ جانا اور اپنے ارادے سے باز رہکر صف مین لوٹ گیا اور میرے مال اور رفیق سے کچھ تعرض نہ کیا۔ بعد اسکے نصف میل پر ایک دستہ ملا مگر اس نے کچھ چھیڑ چھاڑ نہ کی چارون طرف گاؤن مین آگ لگی ہوئی اور دھوان چھایا ہوا نظر آیا۔ جب پانچ میل طے کر کے موضع مہوان مین پہونچے تو گاؤن کو ویران پایا وہان دو ایک چوکیدار نظر پڑے ان سے دریافت کیا کہ آگے بھی لٹیرون کے قدم بڑھے۔ جواب دیا کہ یہین تک آئے ہین اور گاؤن کو لوٹ مار کر جلا دیا ہے اور تمام مویشی اور سامان لیگئے ہین۔ بندے نے کہا کہ دوسرے دیہات مین خبر پہونچا دو کہ کل وہ یہان سے بھی آگے کو جائینگے تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر مؤلف مذکور آگے کو روانہ ہوا۔

□□□

بالجبر

گیتا شری
D-1142، گورگرین ایوینو، ابھیہ کھنڈ-۲،
اندرا پورم، غازی آباد موبائل: 9818246059

وہ پرچیاں نہیں زندگی کی عرضیاں تھیں جسے اس کے اندرون کی تنہائیوں نے لکھا تھا۔ ریچل جب کمرے میں داخل ہوئی تو زندگی کی عرضیوں سے جا ٹکرائی۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ تین مہینے میں بند کمرے میں کسی عورت کی تنہائی زندگی کی عرضیوں سے اس قدر بھری ہوگی۔ پچیس سال کی ایک لڑکی سہمی، دبی سی اس تنہائی میں دنیا کے نام، عاشق کے نام، سماج کے نام، ماں باپ کے نام اور زندگی کے نام دنیا کے سب سے چھوٹے چھوٹے خط لکھ رہی تھی۔ سارے خط بے پڑھے تھے۔ شاید پڑھنے کے لئے لکھے ہی نہیں گئے تھے۔ وہ خط نہیں، درد سے بھری چیخ سے پُر بگولے تھے۔ ہر وقت اس بند کمرے میں اٹھا کرتے اور وہیں دفن ہو جاتے۔ لڑکی کے چہرے پر جیسے سیاہی پوت گیا ہو بگولہ۔ پرچیوں عرضیوں کے بگولے میں دھول نہیں سیاہی اڑا کرتی ہے۔ نیلی، کالی، لال سیاہی کی سوکھی پرتیں کمرے کی ہر چیز کو ڈھک رہی تھیں۔ پلنگ، کرسی، میز، دیواریں، فرش سب ان عرضیوں سے پٹے پڑے تھے جنہیں وہ ہر وقت لکھا کرتی تھی۔

پچھلے تین مہینوں میں یہی تو کیا اس نے۔ باہر طوفان اٹھاتی رہی دنیا۔ وہ باہر نہ نکلی، سو نہ نکلی۔ گھر والے دروازے کھٹکھٹا کے ہار گئے، نہیں کھولا تو نہیں کھولا۔ کب چپکے سے کچن سے تھالی اٹھا لیتی اور جینے لائق روٹی کھا کر تھالی سمیت وہیں رکھ دیتی، کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ وہ جینا چاہتی تھی۔ اسی لئے کھاتی تھی۔ جینا ضروری تھا کہ اسے زندگی کے نام بہت سے خط لکھنے تھے۔ وہ احساس زیاں سے پرے جا چکی تھی۔ اسے تو تب پتہ چلا جب ایک اجنبی امریکن لڑکی ریچل نے بتایا کہ تین مہینے سے وہ کمرے میں قید ہے۔ ریچل کے لئے کیسے دروازہ کھول دیا۔ اسے خود یقین نہیں ہوا۔ تین مہینے سے کوئی پکار اسے سنائی نہیں دی۔ سارے حواس نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ کوئی ایک حس جاگی ہوئی تھی جو ہر وقت عرضیاں لکھواتی جا رہی تھی۔ اسی حس

گیتا شری ہندی زبان کی معروف ادیبہ، ناول نگار، افسانہ نویس اور شاعرہ ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی صحافت میں بھی ان کا ایک خاص مقام ہے۔ ہندی صحافت میں ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں ۲۰۰۸-۰۹ میں رام ناتھ گوینکا ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ انہیں بین الاقوامی سطح پر بھی ایوارڈ حاصل ہو چکے ہیں۔

اندر دھنش کے پار، چوپال، دو لفظوں کی ایک کہانی، فری برڈ، بہہ گئی بیگن ندی وغیرہ ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔ پیش ہے ان کی مشہور کہانی **'آئی واز رپیڈ ٹوائس'**، جس کا اردو ترجمہ **نجیب انصاری** نے کیا ہے۔ (ایڈیٹر)

کے ماتحت تھی وہ ان دنوں۔

ریچل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کمرے کا معائنہ کیا۔ دونوں اجنبی تھے ایک دوسرے سے۔ ریچل کی نگاہیں جہاں پھٹی ہوئی تھیں۔ شالوی کی نگاہیں سپاٹ، بنجر کی طرح اسے ڈرا رہی تھیں۔ شالوی چپ چاپ پلنگ پر جا کر بیٹھ گئی۔ ریچل تھوڑی دیر ٹھٹکی رہی۔ اسے ایک پل کو سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کیسے شروع کرے، کیا کہے..... وہ پہلا جملہ بنتی رہی۔ اندرون، تعارف تو پہلے ہی کرا چکی تھی، دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے۔ آدھا گھنٹہ لگا، ریچل کا گلا سوکھ گیا۔ بولتے بولتے..... کیا کیا نہیں کہا، خود کے عورت ہونے کا حوالہ دیا، ساتھ ہونے کا وعدہ کیا، ساتھ کہیں دور نکل جانے کا بھروسا دلایا، سماج سے لڑنے کا حوصلہ دیا، زندگی کی دہائی دی، اسے اپنی عزت کی یاد دلائی، سب بے اثر۔ دروازہ پیٹتے پیٹتے، بولتے بولتے تھک کر ماتھا پیٹ لیا ریچل نے۔ بالآخر وہی کہہ گئی جو اسے نہیں کہنا تھا۔ سوچ کر آئی تھی کہ آشیش کا نام نہیں لے گی۔ اسے اندازہ تھا کہ آشیش کے نام سے بھڑک سکتی ہے۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے نسوانی جذبات کو کیش کرنا چاہتی تھی۔ جس جذبے نے اسے اس دروازے تک پہنچایا تھا، اس کے تار وہ شالوی سے بھی جوڑنا چاہتی تھی۔ ریچل کے منہ سے نکل گیا.....

'میرے لئے نہ سہی، آشیش کے لئے کھول دو دروازہ..... اس نے خط بھیجا ہے تمہارے نام..... وہ اپنے کئے پر بہت شرمندہ ہے، میں اسکی معافی لے کر آئی ہوں..... اس کو معاف کر دو..... خط پڑھ لو..... میں واپس چلی جاؤں گی..... ایک بار..... مل لو..... بات کر لو مجھ سے..... میں مہمان ہوں تمہاری..... شالوی..... پلیز.....' آشیش تم سے شادی کرنا چاہتا ہے..... نے تمہیں امریکہ بلایا ہے..... میں تمہیں لینے آئی ہوں۔

دھڑاک سے شالوی نے بغیر کسی جوش کے دروازہ کھولا جیسے اس جملے کا کوئی حوصلہ مندانہ اثر نہ ہوا ہو۔

ریچل کے ساتھ کھڑی شالوی کی ماں کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ شالوی ایک اجنبی لڑکی کے اصرار پر دروازہ کھول دے گی۔ آشیش کا نام اس دروازے کے لئے پاسورڈ ثابت ہوا تھا۔ ریچل نے تو اپنی طرف سے آخری ہتھیار چھوڑا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ خالی ہاتھ لوٹنا پڑے گا لیکن دروازہ کھل گیا تھا اور اندر کچھا کے کے سفر کے لئے ریچل تیار نہ تھی۔ ریچل جب جنک پوری کی اس تنگ گلی میں داخل ہوئی تو اندازہ نہیں تھی کہ ہندوستان کا اعلیٰ متوسط طبقہ ابھی بھی تنگ گلیوں میں بستا ہے۔ اسے تو گڑگاؤں کی اونچی اونچی عمارتیں دیکھ کر یقین تھا کہ تنگ گلیوں سے نکل کر لوگ یہاں شفٹ ہو گئے ہوں گے۔ شالوی کے گھر کا پتہ چھوٹے سے کاغذ پر لکھ کر ساتھ لے کر گلی میں داخل ہوئی تھی۔ اپنے ساتھ آئے مرد دوست کو اس نے گلی کے موڑ پر ہی روک دیا تھا۔ پہلی بار اسے ساتھ لے کر جانا درست نہیں لگا۔ مرد دوست روہن وہیں چائے کی دوکان پر بیٹھ گیا۔ ریچل گلی میں چلتی چلی گئی۔ ایک آدھ چھوٹی چھوٹی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں کہیں کوئی عورت بیٹھی دکھائی دی تو کہیں کوئی ادھیڑ مرد۔ اس نے کاغذ پر ہندی میں لکھا پتہ دیکھا۔ دکان پر بیٹھی تھلتھلی عورت نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ سو میٹر آگے جا کر دائیں طرف مڑ جائیں پھر وہاں کسی سے دریافت کر لیں۔

دوپہر میں گلی کچھ خاص خالی سی تھی۔ رکشہ اور سائیکل کی آمد و رفت تھی مگر بھیڑ بھاڑ کم تھی۔ ریچل گلی کے اندر پیوست ہوتی جا رہی تھی۔ عورت کے بتائے، گلی کے موڑ سے وہ دائیں مڑی تو ایک ادھیڑ آدمی لٹھ کھڑاتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ کوئی اور دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ اس سے پوچھے۔ پکی گلی کے دونوں طرف بنے مکانوں کے دروازے یا تو بند تھے یا ان پر پرنٹیڈ مٹمیلے پردے لہرا رہے تھے۔ اینٹیں بدرنگ ہو چکی تھیں اور کہیں کہیں پلاسٹر اکھڑ کر لٹک گئے تھے۔ ہندوستانی بسنت اتنا سونا اور مٹمیلا ہوتا ہے، ریچل پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ ہندوستان کئی بار آئی تھی فروری میں، سیدھے گواہاٹی گئی۔ وہاں قومی آفات مینجمنٹ کا لائیو ڈیمو دے کر نیویارک واپس ہو گئی تھی۔ دلی بھی ٹھیک سے نہیں گھوم پائی۔ فیب انڈیا سے دو چار کرتے ہی ہندوستان کا سفر مکمل ہو گیا تھا۔ ہندوستان اس کے اندر پیوست تھا کہ پھر آئے گی ضرور۔ کسی نہ کسی کام کے بہانے۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ دوبارہ آئے گی تو

اس طرح کہ جیسے زندگی کی تلاش میں نکلی ہو۔

جنک پوری کی اس تنگ گلی میں جہاں مکان ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک گرا تو دوسرا اپنے آپ بھربھرا کر گر پڑے گا۔ ان مکانوں کو دیکھتے ہوئے ریچل نے سوچا کہ آفات مینجمنٹ کی ضرورت اور تربیت تو ان گلیوں میں رہنے والوں کو زیادہ ہے۔ ریچل کو محسوس ہوا، اس کی سانسیں گھٹ رہی ہیں۔ گتھم گتھا مکانوں کو دیکھ کر۔ ایک دوسرے پر چڑھ آنے کو بیتاب مکان۔ کیسے ان کے اندر زندہ لوگ رہتے ہوں گے۔ ایسے مکانوں کو بدلتے موسموں کا پتہ کیسے چلتا ہوگا۔ باہر اونچے برآمدوں میں ایک آدھ گملے میں لگے پودوں سے یا گلی میں آنے جانے والے چہروں سے، کوئی تو ہوگا جو موسم کا پتہ لاتا ہوگا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ بغیر باہر جھانکے اندر کیسے جیتے ہوں گے لوگ۔ بسنت غائب ہے اس سیمنٹ کے جنگل میں۔ بسنت تو پیڑوں پر دکھائی دیتا ہے۔ وینس کے گھروں کی کھڑکیوں پر لدے سدابہار پھولوں کی طرح سوچتے سوچتے اسے اپنا گھر یاد آیا۔

نیویارک سے ایک گھنٹے کی دوری پر لانگ آئیلینڈ میں بنی کوٹھیاں کتنی دیدہ زیب لگتی ہیں۔ گھر کے آگے پیچھے گھاس کے بڑے میدانوں اور پیڑ پودوں کی قطاریں۔ پیچھے کے جنگل سے ہرن اور خرگوش کبھی بھی نادیدہ خواہشوں کی طرح قلانچے بھرتے چلے آتے ہیں اور غائب بھی ہو جاتے ہیں۔ ایسے گھر کو چھوڑ کر کبھی مین ہٹن کے اپارٹمنٹ میں جانے کا دل نہ چاہا۔ روز ٹرین سے سفر کر کے نیویارک میں واقع دفتر آنا منظور تھا اسے مگر مکان پر سوار مکان بالکل نہیں پسند۔

جنک پوری کے گلی میں رہنے والے شالوی کے کنبہ پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔ آشیش نے بتایا تھا کہ شالوی کے والد ساؤتھ کوریا میں بیوٹی پروڈکٹس کی تجارت کرتے ہیں۔ صرف ماں اور بیٹی دلی میں رہتے ہیں۔ شالوی نے دہرادون میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اتنا خوشحال کنبہ کیوں اس گلی میں رہے گا۔ یہ سوچ کر حیران ہو رہی تھی۔ گلی کے موڑ پر جیسے ہی مڑی، ہرے پیلے رنگ کا دو منزلہ مکان دکھائی دینے لگا۔ تیزی سے قدم بڑھائے مکان کا برآمدہ گلی کی سڑک سے ملا ہوا تھا۔ چھوٹا گیٹ تھا، اندر سے بند۔ اس نے گیٹ سے اندر ہاتھ بڑھا کر کھول لیا۔ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سامنے دروازہ تھا۔ وُڈین کلر کا، نقاشی دار۔ باہر

نیم پلیٹ پر لکھا تھا:

شری شالو پرساد ورما، سدھا ورما اور شالوی

سمجھ گئی کہ صحیح پتے پر پہنچی۔ بہت ہمت کر کے گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر تک۔ پہلے برآمدے کی کھڑی سے کوئی جھانکا۔ تھوڑی دیر سناٹا رہا پھر گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا۔ ایک ادھیڑ مرد اور ان کے پیچھے ادھیڑ عورت جن کے چہروں پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کر اسے اجاڑ کر مفہوم سمجھ میں آیا۔ ڈرائنگ روم میں سجاوٹ اچھی تھی، لیکن سب بیجان لگ رہے تھے جیسے کسی نے مدتوں سے انہیں چھوا نہ ہو۔ ریچل کو دیکھ کر دونوں تھوڑا پریشان ہوئے۔ ریچل نے آفات مینجمنٹ کا ہنر دکھاتے ہوئے انہیں اپنی باتوں سے نارمل بنا لیا۔ ہندی مکس انگریزی میں وہ کافی ماہر تھی لیکن اس کے ہوش اڑ گئے جب پتہ چلا کہ جس کی تلاش میں وہ یہاں تک آئی ہے وہ پچھلے تین مہینے سے ایک کمرے میں قید ہے اور اپنے گھر والوں سے بھی بات نہیں کی۔ باہری دنیا سے خود کو پوری طرح کاٹ لیا ہے۔ ریچل حیران تھی۔ اسے یہاں تک آنے سے پہلے ایسا اندیشہ نہیں تھا۔ اس کے تصور سے پرے تھا کہ کوئی لڑکی خود کو کمرے میں اس طرح قید کر لے۔ وہ بے چین ہو اٹھی۔ دونوں ادھیڑ لوگوں نے بہت روکا لیکن وہ نہ رکی۔ اس نے یقین دلایا کہ ایک بار اسے موقع دے کر دیکھیں۔ ہوسکتا ہے حالات معمول پر آجائیں۔

والد بولے، 'پہلے جیسی تو نہیں ہو پائے گی نا'

ماں بولی، 'ہماری عزت تو واپس نہیں آئے گی نا'

ریچل حیران تھی لیکن ہندوستانی سماج کی ذہنیت سے ناواقف نہیں تھی۔ اتنا تو مطالعہ اس نے کر ہی لیا تھا کہ کسی بھی صورت حال کو ہینڈل کر سکے۔ وہ کمرے کے اندر بند شالوی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس کے سابق، مفرور عاشق کا خط اسے پڑھوانا چاہتی تھی۔ اسے اندھیروں سے باہر لانا چاہتی تھی۔ کیا سوچ کر آئی تھی، کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ ریچل اس چھوٹے سے کمرے کے باہر کھڑی ہو کر دیر تک آواز لگاتی رہی۔

گہرے صدمے میں غرق دونوں ادھیڑ لوگوں کو اس نے ڈرائنگ روم میں ہی روک دیا۔ اتنا سب کچھ کرنے کے لئے ریچل کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے، وہی جانتی ہے۔ کسی اجنبی، غیر ملکی لڑکی پر بھروسہ اتنا آسان کہاں۔ وہ بھی حادثہ والے گھر میں اعتماد کی بحالی جلدی ممکن نہیں ہوتی۔ ریچل نے اپنا شناختی کارڈ سامنے رکھا، آشیش کا میسج دکھایا، خط دکھایا، اپنا پاسپورٹ، ویزا سب .....اور آخر میں اپنا عندیہ بھی بتایا۔ عندیہ نے ہی دونوں ادھیڑ لوگوں کو تھوڑا مطمئن کیا۔ ریچل نے آشیش کو امریکہ فون لگایا اور صورت حال بتا کر فون شالوی کی ماں کو پکڑا دیا۔

'تم نے اچھا نہیں کیا بیٹا..... جب اسے تیرے ساتھ کی ضرورت تھی، تو اسے چھوڑ گیا۔ ہمیں زمانے سے نہیں، تجھ سے گلہ ہے۔ کیسی محبت تھی تمہاری۔ اس کے جسم سے محبت کرتے تھے کہ اس کی روح سے۔ محبت کیا جسم سے ہوتی ہے..... من کچھ نہیں ہوتا۔ اتنی جلدی کیسے من الگ ہو گیا تمہارا ..... مجھے تو سب کچھ بتاتی تھی شالوی..... اس رات تمہیں نے اس پر پارٹی کے لئے دباؤ بنایا۔ دیر رات ہوئی تو تمہیں چھوڑنے آنا چاہئے تھا ..... تم نے میری بیٹی کو درندے کے حوالے کر دیا اور اب پلہ جھاڑ گئے ..... تمہیں سماج کی فکر ہو رہی ہے اور مجھے نہیں ..... ہمارے اوپر کیا بیت رہی ہے، تم تصور کر سکتے ہو ..... میری بیٹی کا کیا قصور تھا ..... وہ زندہ رہی ..... تمہارے لئے ..... سوچا کبھی ..... ہمارے لئے، ہماری اکلوتی بیٹی ہے ..... مر جاتی تو ہم کہاں جاتے ..... تم درندے سے کم نہیں نکلے، اس نے تو زندہ چھوڑ دیا ..... تم نے تو جیتے جی مار دیا ..... دوہرا صدمہ ننھی سی جان نہیں جھیل پا رہی ہے، مر جائے گی ایک دن بند بند ..... تمہیں میری بددعا لگے گی ..... دیکھنا ..... بزدل کہیں کے .....'

شالوی کے والد دیوار سے ٹک کر غم میں ڈوبے تھے۔ چشمے کے اندر آنکھیں ڈوب چکی ہوں گی۔ ریچل نے فون ان کے ہاتھ سے لیا۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھیں جیسے لمبے عرصے سے جمی ہوئی خاموشی میں دھما کا ہوا ہو۔ فون پر آشیش گڑگڑا رہا تھا ..... 'آنٹی جی ..... پلیز ..... میری بات سنئے ..... آئی ایم سوری ..... مجھ سے بڑی بھول ہو گئی ..... میں کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں ..... مجھے اس حالت میں آپ سب کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے تھا، شالوی کو ریچل سے ملوا دیجئے'

'چلو، کیچ یو لیٹر .....' ریچل نے فون کاٹ دیا۔ وہ بحث کرنے کے بجائے مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں یقین کرنے والی لڑکی تھی۔ ابھی جس مشن پر آئی تھی، وہ چاند کے مشن سے زیادہ مشکل لگ رہا تھا جیسس سے دعا کر رہی تھی من ہی من کہ سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہو کہ مشن کامیاب رہے۔ یہ زندگی کا پہلا آفات مینجمنٹ تھا جس میں وہ فیل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ یہ صرف زندگی ہی نہیں، تعلقات کی بازآبادکاری کا بھی معاملہ تھا۔ فون پرس میں رکھ کر وہ دروازے پر کھڑی ہو گئی تھی۔

شالوی کی ماں کو ریچل کسی فرشتے کی طرح لگی جو کلنک سے آزادی کا پیغام لے کر اس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ آشیش کو فون پر خوب کوسا، لیکن من ہی من میں مطمئن ضرور ہوئی کہ ان کی بیٹی کی زندگی بدل جائے گی۔ آشیش شادی کے لئے تیار ہو گیا ہے۔ یہ بڑی خبر تھی سب کے لئے۔ شالوی بھی اسی غم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ شاید یہ سن کر خوش ہو جائے۔ شالوی کی شادی کے بارے میں سوچ کر من ہی من بہت راحت مل رہی تھی۔ اندھیرے میں روشنی کی کرن نظر آئی کہ شاید ان کی بیٹی اس صدمے سے نجات حاصل کر لے۔ یہ جگہ چھوڑ جائے، کمرے سے باہر نکلے اور دنیا کا سامنا کرے۔ کچھ بھی کرے بس ایک بار کمرے سے باہر نکلے۔

وہ اس خوف سے باہر آنا چاہتے تھے جس نے پچھلے تین مہینے سے انہیں ہلکان کر رکھا تھا۔ ہر لمحہ وہ اس خوف میں جیتے تھے کہ پتہ نہیں کب کیا انہونی ہو جائے۔ پتہ نہیں لڑکی کیا کر گزرے۔

پچھلے تین مہینے سے وہ ہوش میں نہیں تھی۔ والد

کوریا کا کاروبار چھوڑ کر گھر میں قید ہو گئے تھے اور ماں صرف دودھ کی تھیلی لینے یا سبزی لینے ہی بمشکل جا پاتی تھی .....اتنے میں ہی سو بار مرتیں جب آتے جاتے لوگ عجیب نظروں سے گھورتے یا کوئی عورت سوال کر بیٹھتی.....

'آپ کی بیٹی کے ساتھ ہی ہوا نہ؟'

دودھ کی تھیلی لئے وہ سرپٹ بھاگتیں گھر کی جانب .....گھر آ کر دیر تک سسکتی رہتیں۔ بیٹی کے دروازے تک جا کر زور زور سے چلاتیں.....

'چل باہر نکل.....ہم یہاں سے کہیں دور چلے جائیں گے.....ہمیں نہیں رہنا اس علاقہ میں.....ہم نہیں رہیں گے یہاں.....ہم پاپا کے ساتھ کوریا چلے جائیں گے.....گڑگاؤں شفٹ ہو جائیں گے.....تو نکل تو سہی یہاں سے.....'

اندر سے کوئی آواز نہیں آتی۔

بے بس، بے یار و مددگار ماں کے منھ سے پھر بھدی سے گالی نکل جاتی.....

'مر ہی جاتی اس سے اچھا.....زندہ رہ کر یہی تماشا کرنا تھا تو .....ہم کب تک ایسے جئیں گے .....ہمیں کس بات کی سزا دے رہی ہے.....؟'

اندر سے آواز آتی.....مہین سی.....

'پلیز.....لیومی الون.....'

اس کے بعد خاموشی .....ماں دیر تک سسکتی رہتی۔ آہ و بکا کا لمبا دور چلتا اور والد ماتھے پر ہاتھ رکھے صوفے پر دراز ہو جاتے۔ زندگی سب کے لئے ایک سوال بن گئی تھی۔ تین لوگوں کی آہوں اور کراہوں کی بھٹی میں تبدیل ہو رہا تھا گھر۔ تینوں چاہتے تھے کہ ان کا گھر پورے محلے سے کٹ کر سمندر میں بہنے لگے، کسی جزیرے میں بدل جائے۔ کسی سنسان ریاست میں وہ اس سے باہر آئیں۔ اجداد کے مکان آسانی سے کہاں ہلتے ہیں۔ ان کی روحیں اس کی بنیاد کو سیکڑوں سال بچائے رکھتی ہیں۔ یہی احساس شالوی کے والد کو نہ ہوتا تو کب کا اس گھر کو چھوڑ دیا ہوتا۔ پشتینی مکان کی محبت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اس سانحہ کے بعد سے انہیں لگ رہا تھا کہ سارے آباواجداد مکان چھوڑ کر رخصت ہو گئے ہیں۔ انہیں بھی اس گھر کو چھوڑ دینا چاہئے۔ وہ مکان کی محبت سے آزاد ہو چکے تھے۔ کسی انجان شہر میں آباد ہونا چاہتے تھے جہاں کوئی دس سوال نہ پوچھے، جہاں نگاہیں سزا یافتہ مجرم کی طرح نہ گھوریں۔ جہاں ان کی بیٹی کو منھ نہ چھپانا پڑے، اسے برقع پہنا کر عدالت نہ لے جانے پڑے.....مگر جائیں تو کیسے .....اندر کمرے میں بند شالوی تک ان کی آوازیں نہیں پہنچتیں۔ بیٹی باہر نکل کر بات کریں تو جائیں کہیں۔ جب دل چاہتا ہے اپنے آپ چپکے سے نکل کر ضروری سامان لیتی اور پھر کمرے میں خود کو قید کر لیتی ہے۔ دونوں دھڑکتے دل سے ریچل کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔

اور دروازہ کھلا۔

ریچل کو لگا، خلائی جہاز کے باہر پوری کائنات اپنے اسراروں کے ساتھ حاضر ہو گئی تھی۔ چھوٹے سے کمرے میں ستاروں اور سیاروں کی طرح چھوٹی چھوٹی پرچیاں دیواروں پر چپکی ہوئی تھیں۔ بند کمرے سے بدبو آ رہی تھی۔ مہینوں سے جہاں دھوپ اور ہوا نہ پہنچ پائی ہو تو وہاں کیسا لگے گا۔ کمرے میں گھٹتی ہوئی سانسو کی بو اور گرماہٹ بھری ہو جیسے .....جو چھوڑی تو گئی، باہر نہیں نکلی .....دیواروں پر چپک کر رہ گئی ہو.....نمی پیدا کرتی ہوئی۔

ریچل نے بات کرنے سے پہلے کھڑکی کھولی، پردہ ہٹایا، سامنے متصل چھت پر کوئی نوجوان عورت آنا جانا کر رہی تھی۔ اس کا دھیان دوسری طرف تھا۔ ریچل کی سمجھ میں آیا کہ اس کمرے کی کھڑکی کیوں بند رہتی ہے۔ متصل چھت پر جانے کتنے لوگوں کی آوازیں آتی ہوں گی، ان کی چہل قدمیاں ہوں گی، پھسپھساہٹیں ہوں گی۔ اپنی تنہائی میں محصور اکیلی لڑکی باہر کے مناظر اور آوازوں سے بیزار ہو چکی ہوگی۔

'اس تنہائی میں کیا کر رہی ہیں آپ؟'

'میں آپ کو جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔'

'میں آپ سے بات کرنے، کسی کا میسج آپ کو دینے کے لئے پابند ہوں۔' ریچل ہولے سے مسکرائی۔

'اٹس مائی لائف .....جیسے چاہوں جیوں .....میرے انتقام لینے کا طریقہ یہی ہے.....'

'آئی انڈر اسٹینڈ' ریچل نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کی دبلی پتلی سوکھی ہتھیلیوں کو تھامنا چاہتی تھی۔ اکثر کسی کو لمس سے بھی جان جاتے ہیں۔ جسم کی مہک اور جسمانی لمس اکثر شخصیت کے اسرار کو عیاں کرتے ہیں۔ وہ چھونا چاہتی تھی تاکہ فوراً اپنے پن کی نرمی اس کے اندر پیدا کر سکے لیکن شالوی سخت ہو چلی۔

'بہتر ہو آپ یہاں سے چلی جائیں .....میں آپ سے کوئی بات نہیں کر پاؤں گی۔' شالوی نے دبلی بانہیں اٹھا کر دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

'میں تمہیں اس حال میں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی.....تم بات کرو یا نہ کرو .....میں کسی مقصد سے آئی ہوں .....اسے حاصل کئے بغیر تو ہلوں گی بھی نہیں .....تم چاہو تو دھکا دے سکتی ہو.....' ریچل مسکرائی۔

شالوی نے منھ پھیر لیا۔ تھوڑی دیر ماحول بوجھل رہا۔

'میں کیا بات کروں آپ سے، خود کو تلاش رہی ہوں.....زندگی کے کچھ ضرور سوالوں کے جواب ڈھونڈ رہی ہوں۔'

شالوی اس کی طرف مڑی۔ دونوں آنکھیں بیابان تھیں۔ گہرائی میں دھنسی ہوئی۔ جیسے بہت کوشش کر کے پتلیاں اوپر آ رہی ہوں۔ ریچل اندر سے ہل گئی۔

'اس تنہائی میں محصور ہونے سے کچھ نہیں ملے گا۔ دنیا سے بھاگو مت، سامنا کرو، تبھی ڈھونڈھ پاؤ گی خود کو، جتنا منھ چھپاؤ گی، لوگ اتنا ڈھونڈیں گے تم کو .....شرمندہ کریں گے .....ڈٹ کر جواب دو .....تم گنہگار نہیں ہو.....نہ ہی تم نے کوئی گناہ کیا ہے.....باہر نکلو.....پلیز.....'

ریچل نے بولتے بولتے دروازہ پوری طرح کھولا۔

مارچ کے ہلکے گنگنے موسم میں سیلنگ فین ہائی اسپیڈ پر چلا دیا۔ دیوار پر لگی ساری پرچیاں پھڑ پھڑانے لگیں۔ پھڑ پھڑ کی عجیب سی آواز سے کمرہ بھرنے لگا۔ چھوٹی، دبلی پتلی، لاغر شالوی کبھی سخت، کبھی سہمی، مشکوک نگاہوں سے ریچل کو دیکھ کر رہی تھی۔ لمبی چھریری ریچل نے غور سے اسے دیکھا۔ بہت خوبصورت، گلابی ہونٹوں والی لڑکی مرجھا چکی تھی۔

ریچل نے دیواروں پر چپکی ہوئی پرچیوں کو پڑھنا شروع کیا.....ہندی بالکل نہیں پڑھ سکتی تھی۔ پرچیاں دونوں بھاشاؤں میں تھیں۔

'آئی ایم دا بیسٹ'

'آئی ایم ناٹ گلٹی، مجھے کیوں گنہگار سمجھا گیا'

'آئی ایم ساری'

'آئی وِل بی بیک سون'

'لیومی الون'

'میں زندہ رہنا چاہتی ہوں'

'آئی ایم ناٹ اے باڈی'

'آئی ایم اے سول'

'میں ناپاک نہیں ہوں'

'میں زندہ رہنا چاہتی ہوں'

'آئی لو مائی لائف'

'تمہیں ایسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے تھا'

'تم بزدل ہو، میں ایک کلنک ہوں'

'تم بھی آخر ایک ٹپکل انڈین مرد ہی نکلے'

'میں ایک کھوئی ہوئی موج ہوں'

'زندگی کے دکھوں سے کوئی بھاگ نہیں سکتا'

'آنسو دکھ کو دھو ڈالتا ہے، ہنسی اسے چمکا دیتی ہے'

'ریپ میں عورت مزہ نہیں لیتی، سمجھے'

'میں واپس آؤں گی زندگی، زندگی خدائی نعمت ہے'

'زندگی کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے'

'جسم ایک پاکیزہ تخیل ہے، لیو اِٹ'

'اندھیرا ہی مستقل ریلیف ہوتا ہے، روشنی دھوکہ'

'محبت میں کوئی جگہ نہیں ہوتی پناہ کی'

'محبت ایک ناممکن عمل ہے۔ ڈونٹ ریپیٹ اِٹ'

'اپنی تنہائی کے کھنڈر میں محفوظ ہوں'

'آئی ایم دی بیسٹ .....' ہر چوتھی پانچویں پرچی پر اس سطر کو دہرایا گیا تھا۔

جانے کتنی باتیں، فریادیں، عرضیاں، زندگی کی عدالت میں داخل ہو رہی تھیں۔ بیڈ پر کچھ اوراق رکھے تھے، کچھ لکھا تھا ان پر، ریچل جتنا پڑھ سکتی تھی، پڑھ گئی، ساری پرچیاں پڑھنے کا نہ تحمل تھا نہ وقت۔

شالوی نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں ڈائری کے کچھ اوراق دکھائی دے رہے تھے۔

'آپ پڑھ سکتی ہیں۔ میں پھر سے وہی سب دوہرا نہ پاؤں گی.....آپ کو جو جاننا ہو، وہاں سب کچھ لکھ دیا ہے میں نے.....میں بول نہ پاؤں گی۔'

ریچل نے عدم اعتماد سے اس کی طرف دیکھا۔ ہولے ہولے ہاتھ بڑھا کر ڈائری اور اس کے منتشر اوراق اٹھا لئے۔

''نیند کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہر بار کانپ جاتی ہوں۔ ایک ایک سیڑھی چڑھتے ہوئے لگتا ہے بانس کی سیڑھی چڑھتے ہوئے آسمان میں جا رہی ہوں .....نیند کی دنیا دکھائی نہیں دیتی، بس مسلسل چڑھتی اور اترتی ہوئی خود کو محسوس کرتی ہوں اور بھک سے آنکھ کھل جاتی ہے۔ نیند کی دنیا اندھیرا پردہ ہے جس پر خوابوں کی فلم چلتی رہتی ہے .....اور جاگتے ہوئے جاگنا بھی دہشت ہے میرے لئے.....

کون جگا رہا ہے مجھے .....خوابوں کی اس فلم سے باہر کون بلا رہا ہے.....میں نے ساری پکاریں سننا بند کر دی ہیں۔ مجھے نہیں جاگنا ہے.....پڑے رہنے دو مجھے یوں ہی.....اوندھے منھ.....''

دوسرے صفحے پر لکھا تھا:

''یہ آواز الگ سی ہے .....کچھ کہہ رہی ہے.....خوابوں سے تلاش کرتی ہوئی حقیقت تک آ پہنچی ہے۔ کیسے نظر انداز کروں اس آواز کو.....بہت اپیل ہے اس آواز میں.....

ماں اور پاپا کی آوازیں اب بند ہو چکی ہیں۔ پچھلے تین مہینے میں کسی کی آواز نہیں سنائی پڑی۔ ساری آوازیں جیسے خفیہ تہہ خانے میں جا کر سو گئی ہیں۔ کمرے میں بس میں ہوں.....کچھ عرضیاں ہیں اور نیند کے کچھ اندھیرے ٹکڑے۔

کون آیا ہے میری درد بھری تنہائی میں نقب لگانے۔ میں باہری دنیا سے خود کو کب کی الگ مان چکی ہوں۔ مجھے مت شامل کرو اس شور شرابے میں.....

اوہ .....دستک کی آواز تیز .....تیز اور تیز .....ہار نہ ماننے والی دستک لگ رہی ہے۔ ساتھ میں اجنبی آواز جو بہت بے چین لگ رہی ہے۔''

ایک صفحے پر پوری کہانی لکھی تھی۔

''دہشت کا ایک سایہ اکثر آدھی رات اندھیرے کمرے میں اترتا ہے اور میرے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ کبھی مجھے دبوچ لیتا ہے.....میرے گلے پر کوئی نکیلا ہتھیار رکھ دیتا ہے.....اپنے پنجے میری گردن میں گڑاتا ہے اور پیروں سے میرے دبلے پتلے، چھوٹے سے جسم کو لاک کر دیتا ہے۔ سایہ کان میں

بدبداتا ہے.....

خبردار کسی کو بتایا تو.....تمہاری فلم بنا رہا ہوں.....کسی کو بتایا تو ویڈیو وائرل کر دوں گا۔ بچنا چاہتی ہو تو چپ چاپ میری بات مان جاؤ.....میں نہیں ماروں گا تمہیں.....نہیں تو دیکھ لو، سامنے نالا ہے، روز لاشیں وہاں ملتی ہیں ایک لاوارث لاش اور سہی..... چہرہ بگاڑ کر پھینک دوں گا۔ چپ چاپ پڑی رہ.....''

سایہ مجھ میں اندھیرے کی طرح اترتا چلا جا رہا ہے۔ رگوں کا سارا اجالا باہر چھٹک کر آ گیا ہے .....میں خود کو نہیں پہچان پا رہی ہوں.....میری سانسیں گھٹ گئی ہیں .....مجھے لگا .....میں مر گئی .....سائے نے مجھے جھنجھوڑا .....میں ہلکے ہوش میں آئی .....اوہ .....میں بچ گئی.....سایہ چنگھاڑا.....'کرنے دو مجھے، چپ چاپ پڑی رہ.....'

میں ساکت پڑی رہی..... میں اس وقت مرنا نہیں چاہتی تھی..... جینے کی خواہش مضبوط ہو رہی تھی۔ مجھے لگا اگر میں مزاحمت نہ کروں تو شاید بچ جاؤں، نہیں تو مار دے گا۔ ہلکے اندھیرے میں اس کی آنکھیں جنگلی جانور کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں زندہ رہنا چاہتی تھی تاکہ اس سے بدلہ لے سکوں۔ میں زندہ رہنا چاہتی تھی کہ مجھے آشیش سے محبت تھی اور میں اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ سائے نے مجھے بیہوشی کی حالت میں گلی کے موڑ پر لڑھکا دیا، میرے موبائل کا نمبر لیا۔

میں لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی کہ موبائل بج اٹھا۔

'جب بلاؤں گا، آنا پڑے گا تجھے، سمجھی.....نہیں دیکھا لینا.....خبردار.....کسی کو بتایا.....'

اسی سائے کا فون تھا، جو میری کیب کا ڈرائیور تھا، جس کے ساتھ میں پب سے پارٹی کر کے دیر رات گھر لوٹ رہی تھی۔ وہ نومبر کی شام تھی۔ ویک اینڈ میں دفتر سے اوبے سبھی دوستوں نے طے کیا کہ پیسے پول کر کے پارٹی ہوگی، پب میں۔ آشیش نے کیب بلائی اور مجھے گھر روانہ کیا میں ووڈکا کے ہلکے نشے میں تھی۔ رات بھی زیادہ ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی مجھے نیند آنے لگی تھی۔ میں اونگھنے لگی۔ اچانک ہوش میں آئی جب لگا گاڑی رکی ہے کہیں، کوئی سایہ مجھے دبوچ رہا ہے۔ کیب کا ڈرائیور تھا جو پچھلی سیٹ پر موجود تھا۔ گاڑی کسی گہرے نالے کے پاس رکی ہوئی تھی، ایسا اس کی بات سے پتہ چلا۔ مجھے کچھ دکھائی دینا بند ہو چکا تھا۔

جب میں کنکر دھول سے بھری گلی کے موڑ پر لڑھکا دی گئی، جب وہ تیزی سے چیخے، میری چیخ نکلی، تب مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوا۔ نومبر کی ٹھنڈی رات کی سرد ہواؤں نے مجھے احساس دلایا کہ میں زندہ ہوں کیونکہ میں جینا چاہتی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے موبائل اٹھایا اور جاتی ہوئی کار کی نمبر پلیٹ کا فوٹو کھینچ لیا۔ تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ اتنی رات، شاید آشیش ہوگا، فکرمند ہوگا کہ گھر ٹھیک ٹھاک پہنچی یا نہیں۔ وہ انجانا نمبر تھا۔ ادھر سے دھمکی سنائی دیتی رہی اور فون کٹ ہو گیا۔ جب کار نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے وہی کیا جو ایک زندہ انسان کو کرنا چاہئے تھا۔ جس کے لئے میں زندہ رہنا چاہتی تھی.....''

اس کے آگے کچھ نہیں لکھا تھا۔

ریچل نے سوالیہ نظروں سے اندھیروں سے نبرد آزما سیاہ سائے میں تبدیل ہوتی جا رہی شالوی کی طرف دیکھا۔

'صبح تک ڈرائیور پکڑا جا چکا تھا۔ آشیش کو یہ شکایت ہے کہ میں نے ریپ کی بات پہلے پولیس کو کیوں بتائی۔ یہی شکایت میرے والدین کو بھی ہے۔ سب کا کہنا ہے کہ پہلے انہیں بتانا چاہئے تھا اور پھر سب مل کر سوچتے کہ کیا کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے بات کو دبا دیتے، کسی کو کیا پتہ چلتا لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ ایسا ہو۔ میں جانتی تھی کہ گھر والوں کو بتانے کا حشر کیا ہوگا۔ میں اپنے والدین کو جانتی ہوں۔ ان کی نظر میں میری عزت چلی گئی، ان کی بھی گئی، میری نظر میں عزت وزّت مائی فٹ۔ میری عزت نفس گئی کہ میرے ساتھ زبردستی ہوئی لیکن.....'

لیکن کیا..... ریچل نے اسے چپ دیکھ کر ٹوکا۔ اس کی روح کراہ رہی تھی۔ اس کی زندگی کا پہلا معاملہ تھا۔ ریپ جیسی گھناؤنی واردات سے گزر چکی کوئی لڑکی سامنے کھڑی اپنی بات بتا رہی ہو۔

'آئی فلٹ ایز اِف آئی واز ریپیڈ ٹوائس .....میرے جسم کا نہیں میری روح کا ہوا ہے۔ ایک بار نہیں، دو دو بار ونس بائی دی ریپیسٹ، اینڈ ون بائی آشیش ہمسلف۔ جسم کے زخم بھر گئے، روح کے زخم زندگی بھر نہیں بھرتے میڈم.....'

اوہ ..... ریچل حیران ہو کر سنتی رہی۔ کتنے طوفان سینے میں دبائے ہوئے تھی یہ لڑکی.....اس وقت ایک ساتھ کئی طرح کے جذبات سے گزر رہی تھی۔ شالوی کے لئے بے پناہ ہمدردی، آشیش کے لئے

غصہ، ریپسٹ کے تئیں زبردست نفرت۔ شالوی کا بولنا جاری تھا۔

'جب اس نے کہا کہ یہ بات تمہیں پولیس کو نہیں بتانی چاہئے تھی اور مجھے بھی نہیں، کسی سے بھی نہیں .....کسی کو کیا پتہ چلتا.....تم کون سی ورجن ہو یار.....کس کو شک ہوتا.....'

'چھی.....اتنی گندی باتیں کیسے کرسکتا ہے۔'

'آشیش نے یہ بھی کہا کہ تم نے ریپ کا مزہ لیا .....بیکاز آئی واز ڈرنک.....تم ڈری کیوں .....کیا کرتا، ذرا سا زخم وخم بنتا.....تم بھڑتی تو اس سے.....تم نے ہو جانے دیا.....یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی لڑکی ریپ کیسے ہوجانے دے گی.....نربھیا کا کیس دیکھو.....کیا حالت ہوگئی تھی اس کی.....مرتے مرگئی .....ریپ نہیں ہونے دیا.....'' آشیش.....میں چیخی .....تم چاہتے تھے کہ میں مر جاتی.....وہ مجھے مار دیتا.....آج تم سے بات نہیں کرپاتی میں.....'

'اوکے اوکے.....پولیس کو کال کیوں..... بہت بہادر بننا چاہتی تھیں.....وہائی؟ تمہیں ذرا بھی ہماری عزت کی فکر نہیں ہوئی.....' شالوی کپکپاتے ہوئے بول رہی تھی۔ ریچل نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دبلا پتلا جسم کتنا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ خوف سے یا پتہ نہیں کیوں.....کمرے میں پڑی ہوئی اکلوتی کرسی پر شالوی کو بٹھا دیا۔

'دیکھو جی، اس نے تو ہمیں بعد میں بتایا۔ پہلے پولیس کو فون کرچکی تھی۔ ہمیں بتاتی تو شاید ہم اس کی کوئی مدد کرپاتے.....سوچ بچار کر قدم اٹھاتے.....اس نے سب کچھ جلدی جلدی کردیا.....'

شالوی کی ماں کمرے میں آگئی تھیں۔

'کیا کرتیں آپ، اس کے بعد، جب میں برباد ہوگئی تھی جو مجھے ٹھیک لگا وہی کیا۔ مجھے تو پتہ تھا کہ آپ لوگ کیا کرتے۔ آپ مجھے پولیس کیس نہیں کرنے دیتے اور میرا زندہ رہنے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

شالوی کانپ رہی تھی۔ چہرہ لال بھبھوکا۔ ماں ڈر گئی اور واپس لوٹنے لگی۔

'ہم کم سے کم اس محلے سے چھٹکارا تو پا جاتے۔ یہاں رہ کر ہم پر کیا گزر رہی ہے، تم کیا جانو.....!'

'آپ کو شرم آرہی ہے کہ آپ کی بیٹی کے ساتھ ریپ ہوا ہے.....آپ کی عزت چلی گئی ہے، آپ لوگ منھ دکھانے کے لائق نہیں رہے.....میں سب سمجھ رہی ہوں.....میں ہمیشہ کے لئے آپ لوگوں کو، آپ کا گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی.....آپ پاپا کے ساتھ کوریا چلی جایئے۔'

شالوی ہاتھ جوڑے اپنی ماں سے التجا کر رہی تھی۔ ریچل نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے سب سے اجازت چاہی۔ اتنی راحت کافی تھی کہ شالوی کھل کر بات کر پا رہی تھی اور اس کے اندر کا مواد کافی حد تک بہہ رہا تھا۔ ریچل نے وعدہ کیا کہ کل پھر آئے گی۔ مگر وہ کمرے میں خود کو اس طرح قید نہیں کرے گی۔ شالوی کچھ نہیں بولی.....خاموش.....دیواریں گھورتی رہی۔ اس نے ایک خط پکڑا دیا۔

'اس کا جواب لینے کل آؤں گی۔'

ریچل مسکراتے ہوئے باہر نکلی ہی تھی کہ شالوی کی ماں اس کے قریب آئی، لگا، کچھ کہنا چاہتی ہو۔

'سنئے، آپ شالوی کو باہر سے گھما لایئے، بس دھیان رہے، گلی میں یہ پہن کر جاء، باہر بھلے اتار دے۔'

صوفے پر برقع رکھا تھا۔ ان کا اشارہ برقعے کی طرف تھا۔ ریچل کو بہت حیرانی، غصہ اور ترس تینوں ایک ساتھ آئے۔ اچھا ہوا اس کا کنبہ برسوں پہلے امریکہ میں بس گیا، ہندوستانی سماج، ماں باپ ابھی تک نہیں بدلے۔ من ہی من وہ کچھ ٹھان چکی تھی۔ اس نے شالوی کے پاپا کی طرف دیکھا۔

'انکل ایک بات کہوں، آپ کی بیٹی بہت بہادر ہے۔ عام طور پر لڑکیاں اتنی بہادری نہیں دکھاتیں۔ کتنے کیسیز دبا دیئے گئے، کیس رجسٹر ہی نہیں ہوتے، مجرموں کو شہ ملتی رہتی ہے۔ سانحات ہوتے رہتے ہیں، کہیں تو یہ سلسلہ رکنا چاہئے۔ لڑکیاں جب ہمت کر کے سامنے نہیں آئیں گی، مجرم نہیں پکڑے جائیں گے، تب تک ایسے واقعات ہوتے رہیں گے۔ مجرموں میں خوف ہونا ضروری ہے۔'

شالوی کے پاپا بلک پڑے۔

'آپ لوگوں کو شالوی کی ہمت نہیں توڑنی چاہئے تھی.....ایک لڑکی کی طاقت اس کی فیملی ہوتی ہے اور اسکے ہر ڈسیزن کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے۔'

ریچل تمتما رہی تھی۔ دکھ سے، مایوسی سے اس کے گورے چہرے پر خون چھلک اٹھا تھا۔ پاپا کا رونا رک گیا۔ کچھ پل سناٹا چھایا رہا۔ ریچل نے کندھے اچکائے.....دکھ کی لہریں اس کے اندر اتر رہی تھیں۔ اندرون میں لہریں اتنا ہنگامہ مچاتی ہیں کہ انہیں روکنے کی کوشش میں گلے میں کچھ اٹک سا جاتا ہے۔ کسی طرح خود پر قابو کر کے اس نے اپنا دھیان کسی اور طرف موڑنا چاہا۔

پورے کمرے کا معائنہ کرلیا۔ خاصا خوشحال کنبہ دکھائی دے رہا تھا۔ کئی فن پارے قرینہ سے سجا کر رکھے گئے تھے۔ شلف میں کچھ کتابیں جھانک رہی تھیں۔ صوفے پر فریل والے کشن کور رکھے رکھے تھے۔ صفائی ستھرائی کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ اسے اچھا لگا کہ غم کا اثر ڈرائنگ روم پر نہیں پڑا۔ مطلب دھیرے دھیرے غم ہلکا ہو رہا ہے، صرف شالوی نارمل نہیں ہو پائی ہے۔

ریل سوچ میں ڈوب گئی۔ ایسا کچھ کرنا ہوگا کہ یہ کنبہ پھر سے اٹھ کھڑا ہو، تاکہ دنیا کا سامنا کرسکے۔

شالوی کے پاپا کے پاس جا کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا:

'کیا میں آپ لوگوں کے پاس تھوڑی دیر اور رک سکتی ہوں؟'

ریچل وہیں رُک گئی۔ اس نے فون پر کسی سے

بات کی۔ اسے واپس جانے کی بات کہی اور وہیں صوفے میں دھنس گئی۔

'آنٹی! آپ ہمیں چائے پلایئے..... کڑک .....طبیعت ہری کردینے والی.....'

وہ ماحول کی نحوست کو دور کرنا چاہتی تھی۔ اسے لگا، چائے نہیں ملی تو وہ بھی یہاں کی اداس کا حصہ بن جائے گی۔ پھر اس کیس کا کیا ہوگا۔

اسے کڑک چائے کا بے صبری سے انتظار تھا۔

اگلے دن وہ بدلے ہوئے ماحول کی امید لے کر اس گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اس دن ٹھان کر آئی تھی کہ مشن کمپلیٹ کرلے گی۔ آشیش اور شالوی کو ملا دے گی۔ اسے گلی میں جاتے ہوئے آشیش پر بیحد غصہ آرہا تھا۔ دفتر کا سب سے خاموش لڑکا کتنا درد سمیٹے بیٹھا ہے۔ ذرا سی ہمدردی پاتے ہی بھربھرا کر گر پڑا۔ ریچل کو یقین نہیں ہوا کہ خاموش سا دکھائی دینے والا سافٹ ویئر انجینئر اپنی گرل فرینڈ کو اس لئے چھوڑ آیا کہ اس کا ریپ ہوگیا۔ وہ ورجن نہیں رہی۔ وہ میلی ہوگئی یا اس لئے کہ اس نے ریپ کے وقت جدوجہد نہیں کی۔ اس نے ریپ کا مزہ لیا، بعد میں گلٹ ہوا تو پولیس کو کمپلینٹ کیا۔ اسے مصیبت میں چھوڑ کر امریکہ بھاگ آیا۔

'بزدل کہیں کا.....' پہلا لفظ یہی نکلا تھا اس کے منھ سے۔ یکبارگی من ہوا کہ مدد سے انکار کردے لیکن ہندوستان جانا آفیشیلی طے ہو چکا تھا۔ منع کرتے نہیں بنا۔ پھر رہ رہ کر اسے انجان لڑکی کی فکر ستاتی۔ اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں سوچتی کہ جس وقت اس کو اپنے بوائے فرینڈ کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کیا اب تک وہ اس بزدل کے انتظار میں ہوگی یا بھول چکی ہوگی۔ کس حال میں ہوگی۔ ریچل کا کومل من پگھلتا رہا۔ آشیش گڑگڑاتا رہا، پچھتاتا رہا..... سیدھے بات کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کو تیار تھا۔ کسی طرح اپنی محبت واپس پانا چاہتا تھا۔ اسے امریکہ بلا کر شادی کرنا چاہتا تھا اور کبھی لوٹنا نہیں چاہتا تھا ہندوستان۔ اس شہر، اس گلی، جہاں حادثوں کی یادیں ہوں۔

ریچل نے مدد کے لئے ہاں کردی۔ اس نے لمبا سا خط لکھا۔ دن بھر کمپیوٹر پر لیٹر ٹائپ کرتا رہا۔

اس خط کو ریچل نے نہیں پڑھا۔ وہ چونک اٹھی جب شالوی نے ویسے ہی بند لفافہ اسے واپس کردیا۔

شالوی فریش لگ رہی تھی۔ کمرہ صاف لگ رہا تھا۔ کام والی بائی اسے گھور رہی تھی، اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ اپنی پرچیاں سمیٹنے میں لگی تھی۔

شالوی کی آواز بدلی ہوئی تھی۔

'جب مجھے بہت ضرورت تھی اس کی، کہاں تھا وہ، نہ میری نیندوں میں، نہ میرے خوابوں میں، نہ میرے رونے میں، اب کیا فائدہ.....ہی از آلسو اے ریپسٹ.....اس سے شادی کرنے امریکہ کیوں جاؤں۔ جب اس میں اتنی ہمت نہیں کہ اس گلی سے، اس گھر سے، اس شہر سے میرا ہاتھ پکڑ کر سب کے سامنے مجھے لے جائے تو میں کیوں اس کے فخر کی حصہ دار بنوں کہ اس نے ایک ریپ وکٹم سے شادی کی۔ ایک گناہگار کا بھلا کیا۔

'آئی ایم سوری ریچل۔ آئی ایپری شنیٹ یو۔ آپ نے جو کیا، وہ کوئی کسی اجنبی لڑکی کے لئے نہیں کرے گا۔ یو ڈیڈ۔ اب مجھے کرنا ہے جو کرنا ہے۔ میں تب نہیں مری تو اب کیا مروں گی۔ شاید مجھے کچھ حیرت انگیز کام کرنا ہے اس دنیا میں۔ میں واپس نوکری جوائن کروں گی۔ بس اس گلی، محلے میں نہیں رہنا چاہتی.....چھوڑ جائیں گے یہ گھر.....میں کوریا بھی نہیں جاؤں گی.....یہیں رہوں گی اور لڑوں گی.....مجھے کوئی خوف نہیں.....مجھے ایسی جگہ نہیں رہنا جہاں برقع پہن کر باہر نکلنا پڑے یا دنیا سے منھ چھپانا پڑے۔ سوا لیہ آنکھیں مجھے گھوریں یا کسی کی آنکھوں سے ہمدردی کی بوندیں ٹپکیں.....'

تھوڑی دیر چپ رہی۔ اس کے ہونٹوں سے لگا کہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھی۔

'میں گڑگاؤں شفٹ ہو رہی ہوں۔ میں اکیلے رہنا چاہتی ہوں کچھ دن.....' اس نے فیصلہ کن انداز میں اپنا عندیہ سب کو سنا دیا۔

ماں زور سے چیخی.....'کیا ہوگیا ہے تجھے۔ ہم تین مہینے سے سب جھیل رہے ہیں.....ہمیں فری کرو.....آشیش سے شادی کرلو.....' ان کی چیخ رونے میں بدل گئی۔

'شالوی.....' ریچل دکھی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

آشیش کا دکھی چہرہ دکھائی دینے لگا۔ جھلملاتے آنسوؤں کے درمیان.....کیسے یقین دلائے کہ وہ اسے اب بھی اتنا ہی پیار کرتا ہے۔ کس طرح پچھتاوے میں مرا جا رہا، کتنا رویا، وہ ڈر گیا تھا، سماج سے، پریوار سے، اس وقت ہمت نہیں کر پایا، اب واپس لوٹنا چاہتا ہے، اپنی محبت واپس پانا چاہتا ہے، شالوی! کسی کو بدلنے کا وقت تو دینا چاہئے.....اس نے غلطی مان لی، سدھرنے کا ایک موقع تو ملنا ہی چاہئے.....جانتی ہوں، بڑا صدمہ تھا.....آشیش نے بہت بڑی غلطی کی، معافی تو بنتی ہے.....اب آشیش کو کیا منھ دکھائی دے گی۔ وعدہ کرکے آئی تھی کہ اس کا پیار واپس دلا دے گی۔ وہ فون پر دونوں کی بات بھی کروانا چاہتی تھی، اسکائپ چیٹ کروانے والی تھی.....ریچل کو لگا، اس کے ہاتھ سے نیکی چھن گئی۔

مشن فیل...

خلائی جہاز اپنے مدار سے بھٹک گیا ہے۔ اس کا رابطہ زمین سے ٹوٹ گیا ہے۔ وہ اکیلی کہکشاں کے درمیان چکر کاٹ رہی ہے۔ دور ایک سیارہ دھیرے دھیرے معدوم ہو رہا ہے۔

□□□

ایندھن

حمید دلوائی
۱۹۳۲ ۱۹۷۷

حمید عمر دلوائی مراٹھی زبان کے مقبول ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے مراٹھی زبان میں کئی ناول لکھے۔ مراٹھی کے علاوہ ان کی انگریزی میں بھی کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مراٹھی اور انگریزی زبان پر انہیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تہذیبی اور سماجی مسائل پر مبنی ان کی کئی کتابیں مراٹھی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بحیثیت صحافی اپنے کیریئر کی شروعات کی تھی۔ وہ سیاست میں بھی سرگرم رہے۔ انڈین سوشلسٹ پارٹی کے نمایاں لیڈر کے طور پر بھی انہوں نے اپنی شناخت قائم کی۔ اپنی محض ۴۴ سالہ زندگی کا کافی بڑا عرصہ انہوں نے مسلم طبقہ بالخصوص مسلم عورتوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں صرف کیا۔

اردو کے ادبی رسالوں میں عام طور پر روسی، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کی تصنیفات نظر آجاتی ہیں لیکن اردو ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے تراجم شائع کرنے کا رواج ذرا کم ہے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ 'نیا دور' کے ہر شمارے میں ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ ادب پاروں کے ترجمے پیش کئے جائیں۔ اسی سلسلہ کی آٹھویں کڑی کے طور پر مراٹھی زبان کے مشہور ادیب حمید دلوائی کے ناول 'ایندھن' کی آٹھویں قسط شائع کی جارہی ہے۔

(ایڈیٹر)

دھوبن مسلمانوں کے محلے میں باقاعدگی سے آتی تھی۔ اسے کسی سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ خوف کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں ڈرنے والی کیا چیز بچی تھی۔ مسلمان اب بھی اسے بلا کر کپڑے دیتے اور بیچ بیچ میں ارجنٹ کپڑے لینے کے بہانے اس کے پاس بھی جاتے تھے۔

لیکن کلواڑیوں کو یہ بات پسند نہ تھی۔ انہیں اس کی اس بے نیازی پر حیرت تھی۔ کیا آدمی پیٹ کی خاطر اتنا لاچار ہو سکتا ہے! انہوں نے اس سے مل کر اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ بولی، 'وہی میرے گاہک ہیں۔ ان کا کام چھوڑ دیا تو کھاؤں گی کیا؟ جیوں گی کیسے؟ اب تک وہی میری مدد کرتے آئے ہیں۔ انہی کے سہارے میں جیتی آئی ہوں۔ اب جینے کے لئے کسی اور کی مدد نہیں لینا چاہتی۔'

دھوبن کی یہ منطق کلواڑیوں کو قبول نہ تھی۔ انہوں نے اس کو برا بھلا کہا، رات میں اس کے پاس آنے والے زمینداروں کی بات نکالی لیکن دھوبن پر ان باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ یہ باتیں تو پورا گاؤں جانتا ہی تھا۔ یہ کوئی راز تو تھا نہیں۔

لیکن اب مسلمانوں کے محلے میں گھومنے پھرنے میں اسے عجیب سا احساس ہونے لگا۔ چاروں طرف پھیلا ہوا شک بھرا ماحول اسے پریشان کرنے لگا۔ اس سے کی جانے والی بات چیت کپڑوں کے لین دین تک محدود رہ گئی۔ رات میں اس کے پاس آنے والے مردوں کے چہروں سے دن میں اس کی پہچان غائب ہو جاتی۔ ان کے چہروں پر اسے درشت اجنبیت دکھائی دینے لگی۔ اسے ان چہروں سے اب راتوں کو بھی ڈر لگنے لگا۔ وہ اپنا دروازہ بند رکھنے لگی۔ وہ اندھیرے میں استری جلائے بغیر گھنٹوں ڈری ہوئی اکیلی بیٹھی رہتی۔ باہر دروازے پر ہونے والی دستک کا جواب دینا اس نے بند کر دیا۔

ایک دن شام کے وقت میں پچھواڑے کے آنگن میں بیٹھا تھا۔ واششٹھی ندی کے پانی میں بھاٹے سے پڑنے والا گڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ ریت کا ٹیلہ سا اس کے پاٹ کے بیچ میں ابھر آیا تھا۔ اس پر مویشی ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ ندی کا پانی ڈوبے سورج کی کرنوں سے چمک رہا تھا اور تب سمتی میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

وہ بہت دن بعد ہمارے گھر آئی تھی۔ گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ بابا مویشیوں کے لئے چارا پانی لے کر تبیلے میں گئے ہوئے تھے۔ بھابی کہیں باہر گئی تھی۔ وہ بے چین سی کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے نوکر کو آواز دے کر کرسی منگوائی اور اسے بیٹھنے کو کہا۔

'تم اس کے بعد نہیں آئے؟' اس نے پوچھا۔

میں نے جواب نہ دیا۔ پھر کچھ دیر بعد اس سے پوچھا، 'کس فکر میں ہو؟'

'میں نے ایک خبر سنی ہے۔'

'کیا خبر؟'

'کہتے ہیں مسلمان فساد کرنے والے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟'

'مجھے کیا معلوم؟ تمہیں کس نے بتایا؟'

'سارے گاؤں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے۔'

'یہ جھوٹ ہے۔' میں نے کہا۔

'اور اگر سچ ہو تو؟'

'کم سے کم مجھے نہیں معلوم۔ مسلمان میری صلاح نہیں لیتے۔'

'میں بھی نہیں کہہ رہی ہوں۔ لیکن میں نے سوچا شاید تمہیں اندازہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں صرف یہ جاننے آئی تھی کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔'

'مجھے کچھ اندازہ نہیں۔' ان افواہوں پر یقین کرنے کو میں تیار نہ تھا۔

'مجھے ڈر لگتا ہے۔' وہ بولی۔ 'کچھ پتہ نہیں چلتا، کیا ہونے والا ہے۔ میں گھر میں اکیلی رہتی ہوں۔'

'تو کیا ہوا؟ تمہارا چچازاد بھائی بھی تو وہیں رہتا ہے۔'

'اس کا پاس رہنا کس کام کا! اگر کچھ ہوا تو میری مدد کو نہیں آئے گا۔ اور آج کل تو وہ رات کو گھر پر رہتا بھی نہیں۔ کلواڑیوں اور بودھوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ لگتا ہے وہ لوگ مل کر کوئی سازش کر رہے ہیں۔'

'ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔' میں نے دوبارہ کہا۔ 'اور اگر کچھ ہو تو ہمارے گھر آجانا۔'

'میں یہاں نہیں آؤں گی۔ مجھے تمہارے بھائی کا اعتبار نہیں۔'

پھر وہ چپ ہو گئی اور بے چین نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ میری باتوں سے مطمئن نہ ہوئی۔

'پھر تم بمبئی کیوں نہیں چلی جاتیں۔' میں نے پوچھا۔

'جانا تو ہے ہی۔ تم کب جا رہے ہو؟ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو دونوں ساتھ چلیں۔'

وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی چمکدار آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ میں بے چین ہو گیا۔ اس سے نظر چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا، 'میں ہولی تک یہاں رہوں گا۔ اگر تب تک تم رکو تو ساتھ چلتے ہیں۔'

'ٹھیک ہے۔' وہ بولی۔ پھر کچھ دیر یونہی سُن سی بیٹھی رہی۔ دھیرے دھیرے اندھیرا چھانے لگا اور تب وہ اپنی کیفیت سے باہر آئی۔ 'اب چلتی ہوں۔' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور چلی گئی۔

دوسرے دن وَنے گاؤں کے کچھ مسلمان ہمارے گھر آئے۔ وہ کسی کام سے قصبے میں آئے تھے اور بابا سے ملنے آ گئے۔ بابا کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ چائے پانی ہوا۔ پھر اٹھتے اٹھتے انہوں نے پوچھا:

'خان صاحب، آپ کے گاؤں میں یہ ہندو مسلمانوں کا کیا فساد چل رہا ہے؟'

'کیسا فساد؟' بابا نے غمناک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ پھر انہیں مختصراً ساری بات بتائی۔

قصبے کے دوسرے جھگڑوں کے بارے میں انہوں نے زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ لیکن ہولی کے جلوس کے دوران مسجد کے سامنے باجے بجائے جانے کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے کہا، 'آپ اس کی مخالفت کیجئے۔ سیکڑوں برسوں سے مسجد کے سامنے ڈھول نہ بجانے کا قاعدہ رہا ہے۔ اسے بدلنے والے یہ لوگ کون ہوتے ہیں۔'

'اب زمانہ بدل گیا ہے۔' بابا نے کہا۔

'کیسے بدل گیا! آپ اپنی بات پر قائم رہیے گا۔ پھر سب ٹھیک ہے۔ ہم ہیں نا آپ کے پیچھے۔ پھر گھبرانے کی کیا بات ہے؟'

'گھبرانے کا کیا سوال؟ لیکن یہ سر درد کون مول لے!'

'سر درد کیسا؟ خان صاحب، آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ یہ تو ہمارا حق ہے۔ دینی فریضہ ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، ہمیں ان کو ادا کرنا ہی ہے۔'

تب اچانک ان کا دھیان میری طرف گیا۔ انہوں نے پوچھا، 'یہ آپ کے صاحبزادے کب آئے؟'

'بہت دن ہو گئے۔'

'اتنے برسوں بعد خوب آئے!'

'اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'

'معلوم ہوتا ہے آپ پر اسی بات کا اثر ہو گیا ہے ورنہ آپ جھمیلوں میں پڑنے سے گھبرانے والے نہیں۔'

انہوں نے کہا اور زور زور سے ہنسے۔ بابا کچھ بددل سے دکھائی دئے۔ انہوں نے اس موضوع کو آگے نہیں بڑھایا اور وَنے گاؤں کے مسلمان کچھ دیر بعد چلے گئے۔

اس کے بعد ایک دو بار میں نے ان لوگوں کو سڑک سے گزرتے دیکھا لیکن انہوں نے ہمارے گھر کا رُخ نہیں کیا۔ قصبے میں یہ خبریں پھیلنے لگیں کہ آسَق نے اس سے کوئی گٹھ جوڑ کیا ہے۔ یہ خبریں مجھ تک بھی پہنچیں۔

جنارد ھن نے مجھے بتایا کہ وَنے گاؤں کے مسلمانوں نے مسجد کے پاس پالکی کے جلوس کا راستہ روکنے کا منصوبہ بنایا ہے اور اگر ہندوؤں نے باجے بجائے تو وہ فساد کریں گے۔ جب میں نے بھائی سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا، 'ایسی افواہوں میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ وہ بھلا اپنا کام چھوڑ کے یہاں کیوں آنے لگے؟'

اسی تناؤ بھرے ماحول میں ایک رات مہالکشمی کے استھان پر ہولی کے ڈھول بجنے لگے۔ ڈھول کی یہ تال میں کئی برسوں کے بعد سن رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس آواز کی رفتار بڑھنے لگی اور میں باہر آنگن میں آ گیا۔

باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گھروں کی بتیاں

چاروں طرف ٹمٹما رہی تھیں اور کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ اچانک ڈھول کی آواز بھی بند ہوگئی۔ سب کچھ انتہائی خاموش محسوس ہونے لگا۔ ایک عجیب سی خاموشی ہر طرف چھا گئی۔ اس خاموشی پر کسی ہلکی سی آواز کی کھروچ تک نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ گھروں کی بتیاں گل ہونے لگیں۔ اندھیرے کی یکساں تال ہر طرف گونجنے لگی اور ہوتے ہوتے اس سناٹے میں گھل گئی۔ مجھے لگا ابھی سُدام کی بہو کی چیخوں سے یہ سناٹا ٹوٹ جائے گا، لیکن اس رات وہ چیخیں بھی بلند نہیں ہوئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس رات ہر جگہ خاموشی کی طرز کیسے چھا گئی۔

یہ سناٹا مجھے ڈراؤنا معلوم ہونے لگا۔ بارہ برس کی عمر سے مجھے رات برات بے خوف اکیلے گھومنے کی عادت تھی لیکن اس لمحے آنگن میں اکیلے کھڑے رہنے سے بھی نہ جانے کیوں ڈر لگنے لگا۔ اس خاموشی نے گویا مجھے نگل گیا۔ خاموشی کا یہ چبھتا ہوا احساس میرے لئے ناقابل برداشت ہوگیا۔ مجھے یہ عجیب خیال آنے لگا کہ کم سے کم اس وقت سدام کی بہو ہی چیخ پڑتی۔

میرا جی چاہا کہ دیوی کے استھان پر جاؤں۔ پہلے ہم لوگ ہمیشہ جایا کرتے تھے۔ لوگ اب بھی جاتے ہوں گے۔ لیکن مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ آج رات کوئی وہاں گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ ڈھول بجنا جانے کیوں اچانک بند ہوگیا تھا۔ مجھے وہاں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اسی وقت مجھے یاد آیا ایک کلواڑیوں کی بستی میں میرا کیسا خیر مقدم ہوا تھا اور دیوی کے استھان پر جانے کا خیال میرے اندر ہی غائب ہوگیا۔ میں گھر کے اندر آگیا۔

بابا سو رہے تھے۔ بھائی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بھابی اب تک باورچی خانے میں اپنا کام نمٹا رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

کچھ دیر بعد بھابی کمرے میں آئی۔

'کیا بات ہے؟' میں نے اس سے پوچھا۔

'آپ سے کچھ کام ہے۔ کچھ بات کرنی ہے۔ آپ کو نیند تو نہیں آرہی ہے نا؟'

'نہیں۔'

'میں کچھ دیر پہلے آئی تھی تب آپ کہاں تھے؟'

'آنگن میں۔ یوں ہی کھڑا تھا۔'

'کل پالکی کا جلوس ہے، اس کے بارے میں سوچ رہے تھے، ہے نا؟'

'نہیں۔ کچھ دیر پہلے ڈھول کی آواز کیوں بند ہوگئی، یہ سوچ رہا تھا۔'

'وہی مطلب ہوا نہ۔ آج رات مسلمانوں کی بیٹھک ہے۔ یہ وہیں گئے ہیں۔'

'کہاں؟'

'اسحاق کے گھر۔'

'کس لئے'

'کل کے بارے میں سوچ بچار کرنے کیلئے' (بشکریہ 'آج')

(جاری)

'نیا دور' فروری ۲۰۱۸ء کے شمارے کی ایک جھلک

مقبولیت کی بلندیوں کو سر کرنے والے عہد جدید کے مشہور شاعر بشیر بدر گزشتہ کافی عرصہ سے بستر علالت پر ہیں۔ بشیر بدر پر ایک بھرپور گوشہ 'نیا دور' کے فروری ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوگا جس میں ان کی اہلیہ محترمہ **راحت بدر** کے علاوہ انکے شعری فن اور یادوں پر مبنی **وسیم بریلوی، ڈاکٹر عتیق اللہ، پروفیسر احمد محفوظ، ریشماں پروین، مست حفیظ رحمانی، نور فاطمہ** وغیرہ کے مضامین اور بشیر بدر کا منتخب کلام شامل ہوگا۔

'نیا دور' کے بیحد اصرار پر جدید دور کے مشہور شاعر اور فلمی دنیا کے معروف نغمہ نگار ندا فاضلی کی شریک حیات محترمہ **مالتی جوشی** نے ندا صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضمون ارسال کر دیا ہے۔ ندا فاضلی کی دوسری برسی پر فروری ۲۰۱۸ء کے 'نیا دور' میں ایک گوشہ شائع کیا جائے گا جس میں **جاوید اختر، شکیل اعظمی، راجیش ریڈّی، شاہنواز قریشی، مظہر احمد، حسن کاظمی، عائشہ ضیاء** وغیرہ کے مضامین کے علاوہ ندا فاضلی کا کلام اور ان کی دیگر تخلیقات کے اقتباسات بھی شامل رہیں گے۔

سعید نفیسی
ایران
۱۸۹۵ ۱۹۶۶

آبائی وطن

آج سے اسی سال پہلے، وہ قدیم ایرانی النسل ضعیف العمر شخص، ہرات میں آ کر بسا تھا۔ نصر اللہ آج تقریبا چوہتر سال کا ہو چلا تھا۔ دہخوارقان کا باسی تھا لیکن گردش حالات نے اسے ہرات پہونچا دیا تھا۔ وہ یہاں قلی کا کام کرتا تھا۔ نصر اللہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں کسی چیز سے قلبی تعلق یا دلی لگاؤ نہیں ہوتا۔ چونکہ کم عمری ہی میں یتیم ہو گیا تھا اور شادی بھی نہیں کی تھی اس لئے وہ "خانگی احساسات' کو لغو سمجھتا تھا۔ اگر چلتے راہ کوئی ماں اپنے بچے کو چھاتی سے بھینچے ہوئی یا بچے کو بوسہ دیتی ہوئی دکھ جاتی تو اسے سخت حیرانی ہوتی۔ بلکہ وہ تنفر کے احساس کو ابلنے سے روک بھی نہیں پاتا تھا۔ اس کا کوئی مخصوص گھر نہیں تھا۔ رات میں جہاں جگہ ملتی سو جاتا لہٰذا کسی جگہ سے کوئی قلبی لگاؤ استوار نہیں ہو سکا اور نہ ہی اسے کوئی جگہ کسی دوسری سے بہتر یا اچھی محسوس ہوئی۔ اصل میں یہ بدھا ان لاابالی اور نا ہنجار فلسفیوں جیسا تھا جنہیں دنیا کی کسی چیز سے لگاؤ نہیں ہوتا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں کسی سے محبت نہیں پائی یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار کہتا رہتا کہ وہ کسی سے بندھ کے نہیں رہ سکتا اور اگر کبھی ایسا اتفاق آ جائے کہ اسے یہ دنیا چھوڑنی پڑے تو بلا تکلف اور بغیر کسی افسوس کے چھوڑ دے گا۔ یہی وہ عقائد تھے جن کی بنا پہ وہ کہیں آمد و رفت کو ضروری نہیں سمجھتا اور نا ہی کسی کی طرف دست دوستی دراز کرتا تھا۔

خراسان میں جنگ کا شعلہ بھڑک چکا تھا۔ چند ایرانی فاتح بھی ہو چکے تھے لیکن وہ انگریزی عیاریت کا شکار ہو گئے اور ہرات اور اسکے نواح کو انگریزی حکومت کے سپرد کر دیا۔ ہرات پر انگریزوں کے تسلط کی خبر سے سبھی شدید برافروختہ اور دل ملول تھے لیکن نصر اللہ کو کوئی غم نہیں تھا۔ متمولین شہر، ہزار وطن پرستی کے باوجود ہرات چھوڑنے پہ مجبور ہو گئے اور آہستہ آہستہ خراسان کی طرف کوچ کرنے لگے۔ جس کے پاس جتنی بھی جائداد تھی اسے سستے اور اونے پونے داموں میں بیچ کر مشہد یا

فارسی زبان و ادب کی مشہور شخصیت سعید نفیسی ایک مقبول ایرانی اسکالر، ناول نگار اور شاعر تھے۔ ایرانی تہذیب و ثقافت، فارسی ادب اور صوفی ازم ان کا خاص موضوع تھے۔ انکی تخلیقات کا دنیا بھر میں بیس سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ دم واپسین، بابا خرام الدین، دلاور آذیبائیجان ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔ پیش ہے انکی مشہور کہانی 'آبائی وطن' جس کا اردو ترجمہ **فاطمہ معصومہ ناصری** (ریسرچ اسکالر، جے این یو، نئی دہلی) نے کیا ہے۔
(ایڈیٹر)

ایران کے دیگر شہروں کی طرف ہجرت کر رہا تھا۔

ظاہر ہے ایسے وقت میں، جب کہ نصر اللہ کا کام قلی کا تھا، تو مواقع بڑھ گئے اور آمدنی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ راتوں کو، جب وہ کام سے فراغت پا لیتا.... تو ہرات کے قہوہ خانوں میں بیٹھا ہوا اپنے ہم شہریوں کی اس مہاجرانہ بیوقوفی کو کوستا۔ اسے یہ صرف بیوقوفی اور سفاہت معلوم ہوتی۔ اسکی نظر میں وہ لوگ خود کی جائداد خام خیالی میں فروخت کر کے، بے کار میں عمر کے اس آخری حصے میں سفر کی دشواریاں برداشت کر رہے تھے۔ یہ لوگ "دیوانہ" ہی تو ہیں آخر کیا ہر جگہ زمین نہیں؟..... ہرات اور مشہد میں فرق ہی کیا ہے؟؟ نصر اللہ کو سب سے زیادہ تعجب اس بات پہ ہوتا کہ جب یہ دیوانے خود ہی ہجرت کر رہے ہیں تو اتنے دلگرفتہ اور پشیمان کیوں ہیں؟؟ آخر ان لوگوں کو کسی نے مجبور نہیں کیا؟ پھر کیوں؟؟؟ اگر انہیں بیچ میں اپنا وطن اور شہر عزیز ہے تو ترک کیوں کر رہے ہیں؟ ہرات کے بڑے بوڑھے اور جاننے والے اسے لاکھ سمجھاتے کہ دیکھو انسان اپنے وطن اور مولد سے بے پناہ الفت رکھتا ہے اس لئے جدائی شاق گذرتی ہے لیکن نصر اللہ ان باتوں کو ان سنی کر دیتا۔ اسے اس بات کی پرواہ ہی نہیں تھی اسے سمجھنا بھی نہیں تھا وہ تو اپنے ہی خیال کو صحیح سمجھتا۔ ایک دن... شہر کے ایک متمول خان نے نصر اللہ سے درخواست کی۔

'نصر اللہ... تم اب بوڑھے ہو چکے ہو۔ کام کی طاقت بھی رخصت ہو چکی ہے۔ میں اب ہرات چھوڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس لئے شہر کے باہر میرا جو باغیچہ ہے جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس شہر سے اتنے زیادہ لوگ گھر بار فروخت کر کے جا چکے ہیں کہ اب میرے باغیچہ کو خریدنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ اسے میں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اب تمہیں ہی اس کی پاسبانی کرنی ہے۔ اس باغیچے کے آس پاس کی زمینیں تمہارے نام کر دی ہیں اس سے بیٹھے بٹھائے تمہیں رزق مل جائے گا۔ وہاں

جا کر باغیچہ سنبھال لو۔ بڑھاپا بغیر زحمت اور محنت کے کٹ جائے گا۔' نصراللہ کو تھوڑا بہت اپنی ضعیفی کا احساس تھا۔ وہ تو اللہ سے اس طرح کی عنایت کیلئے دعا بھی کرتا تھا۔ سو اس نے جلدی جلدی اپنا بوریا بستر سمیٹا اور بیرون شہر اس باغیچے میں چلا گیا۔ دیرینہ عادت کے مطابق وہ صبح جلد ہی بیدار ہوتا اور پورے دن باغیچے کے درخت اور پھل پھولوں کی دیکھ ریکھ کرتا۔ جب کام کرتے کرتے تھک جاتا تو باغیچے کی میانی نہر کے کنارے بیٹھ جاتا اور سوچوں میں ڈوب جاتا۔ اس دوران، اس پہ کئی انکشافات ہوئے۔ ایک دن اچانک اسے لگا کہ نہر کے پانی کی تہہ میں کچھ سنگریزے ہیں جو کچھ اس طرح پانی کے نیچے زمین میں پیوست ہیں گویا وہاں گھر بنا چکے ہیں۔ فشار آب کی شدت کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں۔ گویا پانی کا بہاو چاہتا ہے کہ اپنی پوری طاقت سے انہیں ان کے گھروں سے باہر نکال پھینکے لیکن وہ ہار ماننے کو تیار نہیں.... آخر کار.... فشار آب کی سختیاں انہیں انکی جگہ سے اکھاڑ کے نیچے کھینچ لیتی ہے.... لیکن وہ پھر بھی دشمن کے چنگل میں دست و پا زناں ہیں۔ اور ارد گرد تیر جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت حسرت بھری نگاہوں سے اپنے عقب میں دیکھ رہے ہوں اور کمال تاسف اور مجبوری میں اپنے گھروں سے جدا ہو رہے ہوں۔

آخر کار ایک دن آ ہی گیا جب انگریزوں نے ہرات پہ مکمل قبضہ کر لیا۔ مہاجرین کی املاک ضبط ہو گئیں۔ مقبوضہ املاک میں متمول خاندان کا وہ باغیچہ بھی تھا جو بہ وقت ہجرت، نصراللہ کے سپرد کیا گیا تھا جس میں وہ مقیم تھا لیکن اب نصراللہ مجبور تھا۔ خواہ مخواہ اسے باغیچے سے نکال دیا گیا کیونکہ اب اس باغیچے کو کسی نصراللہ جیسے بوڑھے سنتری کی ضرورت نہیں تھی۔

نصراللہ مجبورا باغیچے سے نکل تو گیا لیکن روزانہ باغیچے کے دروازے پہ لوٹ کے آتا اور دروازے کے سوراخ سے اندر کے مناظر نہایت حسرت و یاس سے تکتا..... سچ میں یہ وہی لاابالی اور بے مروت نصراللہ ہی تھا جسے آج باغیچے کے احاطے سے بھی نکلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ اسے ہر وقت اپنے باغیچے کے پھولوں، پودوں اور پیڑوں کی یاد ستاتی۔ جب بھی اسے یاد آتی تو بے ساختہ نئے مالکوں پہ نفرین کی برسات کرتا... اور... کبھی کبھی..... تو.... شدت ناچاری میں.... اس کی بوڑھی آنکھوں کے خشک حلقوں میں آنسو بھی تیر جاتے... وہ بے تحاشہ روتا رہتا۔ اب اس کا خرچ اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ پیٹ پالنے کیلئے اس نے دوبارہ قلی گیری شروع کی... لیکن..... آج کا یہ قلی..... وہ دو ماہ پہلے والا قلی نہیں تھا۔ وہ لاابالی نصراللہ جسے دوستی اور دشمنی جیسے چونچلوں سے نفرت تھی آج مجبور تھا کہ ہر آنے والے مسافر کا سامان اپنے نحیف کندھوں پہ اٹھائے وہ نہایت نفرت کے بغض کے ساتھ سامان اٹھاتا۔ ایسا بارہا ہوتا کہ سامان لادے ہوئے بیچ راستے میں کوئی چیز اسے تحریک کرتی اور وہ سامان زمین پہ پٹخ دیتا۔ غالبا وہ توڑنے کے خیال سے ایسا کرتا تھا۔ یہ دشمنی کا ردعمل تھا۔ نصراللہ کو ان نو واردوں سے سخت نفرت تھی جن کے سبب اسے اپنے باغیچے سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ ایک دن... یونہی.... راستے میں ..... باغیچے کا وہ منظر اس کی نگاہوں میں دوڑ گیا..... سنگ ریزوں کی محکم مقاومت... فشار آب کی شدت... اسے یاد آ گیا کہ کس طرح وہ بے وطن سنگ ریزے پانی کے بہاو کے خلاف پتھر کی دیوار بنے کھڑے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی جگہ چھوڑیں۔ اس دن کے بعد.... ہرات میں کسی نے نصراللہ کو نہیں دیکھا.... دو مہینے بعد.... جن لوگوں نے اسے دیخو ارقان میں نوجوانی کے عالم میں دیکھا تھا... آج دیخو ارقان میں انہیں لوگوں نے ہی ایک ناآشنا کمر شکستہ بڈھے کو دیکھا جو عصا بدست.... گرد آلود گٹھری سر پہ لادے 'رجب علی پدر نصراللہ' کے گھر کا پتہ پوچھ رہا تھا۔

□□□

تنہائی کے سو سال

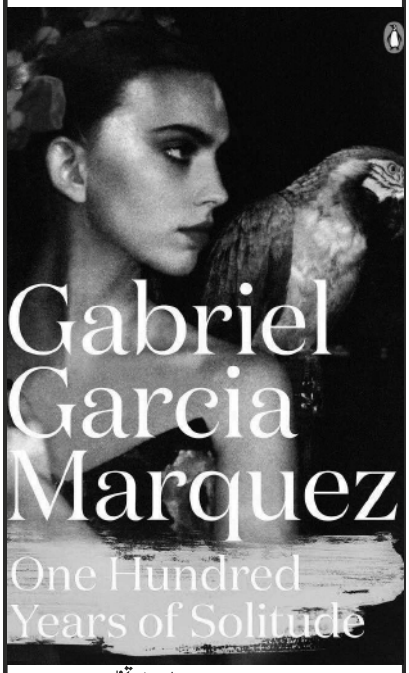

بیسویں صدی کے محیر العقول تخلیق کار 'گارسیا گبریئل مارکیز' کے شاہکار ناول 'تنہائی کے سو سال' کو شائع ہوئے پچاس برس پورے ہو گئے۔ اسی ناول پر انہیں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اسپینش زبان میں مارکیز کو خدا کے بعد سب سے بڑا تخلیق کار تصور کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعد بائبل کے سب سے زیادہ کتابیں فروخت ہوئی ہیں۔ ان کی کتابوں کے دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ عالمی ادب کی اس عظیم شخصیت کی تحریروں کو دنیا بھر میں ابھی بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ مارکیز کی چوتھی برسی پر انہیں بطور خراج اپریل ۲۰۱۸ء کے 'نیا دور' میں ان کے افسانوی فن پاروں پر دور حاضر کے معروف ادیب، نقاد اور محقق جناب **شمس الرحمن فاروقی** اور مغربی ادب کے رمز شناس، مشہور ناول نگار **خالد جاوید** کے مضامین بھی شامل ہوں گے۔ اس کے علاوہ مارکیز کے شہرہ آفاق ناول 'تنہائی کے سو سال' کے اقتباسات کا ترجمہ بھی شائع کیا جائے گا۔

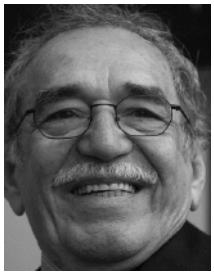

انگریزی کا بھوت

ریاض توحیدی
وڈی پورہ، ہندوارہ (کشمیر)
موبائل: 7006544358

انگریز سے انگریزی نکلی ہے اور جو حسین شئے انگریز کے سازشی ذہن سے نکلے گی بھلا اُس میں مکاری کی صاف صاف چمک شامل کیوں نہ ہوگی اور درویش صفت مسلمان اپنی سادہ لوحی کا بھرم رکھتے ہوئے انگریزوں کی صاف ستھری انگریزی پر اتنا فریفتہ ہورہے ہیں کہ اس کی مکاری کی چمک ان سادہ دلوں کی آنکھوں سے ہمیشہ اوجھل ہی رہی۔ اگر یقین نہ آئے تو ہسٹری کے اوراق پلٹو تو معلوم ہوجائیگا کہ ایک دن جب یہ گورے مچھلیاں تلاش کرتے کرتے ہندوستانی بندرگاہ تک آپہنچے تو اُس زمانے کے مسلمان بادشاہوں کو اپنی چکنی چپڑی انگریزی سے اتنا مرعوب کر گئے کہ وہ بے خودی کے عالم میں ان کو فائدہ مند بھکاری سمجھ کر اپنے ملک میں انھیں تجارت کرنے کی اجازت دے گئے۔ ہندوستان کی چمک دھمک دیکھکر یہ بھکاری مالک بننے کے سپنے دیکھنے لگے اور چند ہی برسوں کے اندر اندر ان تجار ذہن سوداگروں نے اپنے تجارتی نشان یعنی مکاری کا استعمال کرتے ہوئے تمام سلطنت پر قبضہ جما کر اپنے ہی آقاؤں کو دردر کی بھیک مانگنے پر مجبور کردیا۔

انگریزی بولنے کا بھوت میرے سر پر بچپن ہی سے سوار تھا اور یہ بھوت عمر بھر میرے سر پر سواری کرتا رہا ' کیونکہ میں کبھی بھی انگریزی نہیں سیکھ پایا۔ اول سے دسویں تک سرکاری اسکول میں تعلیم پائی۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ سرکاری اسکولوں میں دسویں جماعت تک انگریزی کے سوا تمام کتابیں اردو میں ہوا کرتی تھیں اور انگریزی بھی ایسی کہ میٹرک تک ہم صرف اے فار اپیل اور بی فار بال تک پہنچ پاتے تھے۔ میں پہلے ایک پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسکول بھی کیا تھا وہ تو گاؤں والوں نے ایک غریب کے مویشی خانے کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔ ایک حصے میں انسانی نسل کی پرورش ہوتی تھی اور دوسرے حصے میں حیوانی نسل فروغ پارہی تھی۔ ایک دن جب تعلیم کا کوئی افسر اسکول کا انسپیکشن کرنے کی غرض سے ہمارے اسکول میں داخل ہوا تو نیم اندھیرے میں وہ حیوانوں کے کمرے میں داخل ہوا اور اندھیرے میں وہ جونہی آگے بڑھا تو ایک بیل نے اُسے اپنے سینگ پر اٹھا کر اسکول کے کمرے میں پھینک دیا۔ وہ جب انگریزی میں کچھ بڑ بڑانے لگا تو ماسٹر جی سمجھ گئے کہ یہ ضرور افسر ہوگا اور وہ دوڑ کر اُسے سہارا دینے لگا۔

میں جس اسکول میں پڑھتا تھا وہاں کی پانچ جماعتیں ایک مڈل پاس ٹیچر کے حوالے سرکار نے کی تھیں اور خوش قسمتی سے اُس کو بھی اتنی ہی انگریزی آتی تھی جتنی کہ ہم لوگوں کو۔ ایک دن وہ ہماری جماعت کے بلیک بورڈ پر How کا لفظ لکھ کر بولنے لگے کہ اگر انگریزی سیکھنی ہے تو پہلے How کا تلفظ سیکھو۔ تلفظ سمجھا کر وہ کہنے لگا کہ تم لوگ آج دن بھر کلاس میں صرف اس ہَو کی گردان اونچی اونچی آواز میں کرتے رہوگے۔ ہم نے بھی ماسٹر جی کے سامنے ہی ہَو ہَو کی گردان اس امید پر شروع کردی کہ اب دن بھر ماسٹر جی کی مار نہیں کھانا پڑے گی۔ ہم مستی کے عالم میں ہَو ہَو کا شور کر رہے تھے اور گاؤں کے آوارہ کتوں نے وھنو وھنو کرتے ہوئے اسکول کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہم بھی خوش ہوئے اور ماسٹر جی بھی پتہ نہیں کس گھر میں تمباکو پینے کے لئے چلے گئے تھے اس لئے ہم بھی اسکول کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر کتوں کے وھنو وھنو کا جواب ہَو ہَو سے دیتے رہے۔ اس ہَو ہَو سے ہم نے اُس وقت فراغت پائی جب گاؤ خانے کا غریب مالک ہائے میرے بھیڑ ہائے میرے بھیڑ کرتے ہوئے ہمیں ڈنڈے سے پیٹنے لگا کیونکہ کتے وھنو وھنو کرتے ہوئے مویشی خانے کے اندر گھس گئے تھے اور اُس کے بھیڑوں پر حملہ کر کے ان کی بوٹی بوٹی کر ڈالی تھی۔

میں جب چھٹی کے بعد گھر میں ہَو ہَو کرتے ہوئے داخل ہوا تو میرے دادا جان گھر کی دوسری منزل میں سوئے ہوئے تھے۔ میرا ہَو ہَو سُن کر وہ پریشانی کے عالم میں ڈنڈا ہاتھ میں اٹھا کر نیچے آئے اور ''کہاں ہے کتا' کہاں ہے کتا'' کہتے ہوئے سارے گھر کو چھان مارا۔ جب اُنہیں کہیں بھی کتا نظر نہیں آیا تو وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہاں ہے کتا؟ تو کیوں گھر سے کتا بھگانے کی آواز نکال رہا تھا؟ یہ سنتے ہی میں ہنس کر بولا کہ دادا جان میں انگریزی پڑھ رہا تھا آج ماسٹر جی نے ہمیں اسکول میں انگریزی پڑھائی۔ یہ سنتے ہی دادا جان بول پڑے کہ تمہارے اُس اَن پڑھ ماسٹر کو تو خود یہ ''اُونگریزی'' نہیں آتی تمہیں کیا خاک ''اُونگریزی'' پڑھائے گا۔ وہ آٹھ پاس ماسٹر آج بھی کسی باغ کی رکھولی کرتا ہوتا اگر میں نے منسٹر صاحب سے اُس کی نوکری کے لئے منت سماجت نہ کی ہوتی۔

ہمارے علاقے میں دو دیہات کے درمیان ایک ندی بہتی تھی۔علاقے کے لوگوں کی دیرینہ مانگ کا خیال رکھتے ہوئے سرکار نے ندی کے اوپر ایک چھوٹا سا پل تعمیر کروایا۔متعلقہ محکمہ کے کاغذی ریکارڈ کے مطابق پل کی تعمیر پر لاکھوں روپے خرچ ہوئے تھے۔تعمیر شدہ پُل پر پہلے منسٹر کے قدم پڑنے لازمی تھے۔ایک دن جب ایک منسٹر صاحب کے ساتھ ساتھ متعلقہ محکمے کے افسران بھی ٹھیکیدار سے پُل پر صرف شدہ رقم کا حساب کتاب کر کے پل کو الوداعی سلام کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے تو علاقے کے لوگوں کے سامنے اسٹیج پر منسٹر صاحب نے انگریزی میں اپنے فلاحی اور تعمیراتی کارناموں کی روداد بیان کرنا شروع کردی۔لوگوں کے پلے اگرچہ کچھ بھی نہیں پڑتا تھا تو بھی وہ مسکراتے ہوئے کبھی کبھی تالیاں بجایا کرتے تھے اور منسٹر صاحب تقریر کے دوران پیارے ووٹر اور پُل کا لفظ بار بار دہرا رہا تھا۔ لوگوں میں منسٹر کا ایک ان پڑھ چمچہ میرے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔وہ پُل کا لفظ سنتے ہی بندر کی طرح اچھل کر منسٹر صاحب زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیتا تھا۔ میں اُس کی اُچھل کود دیکھ کر محسوس کر رہا تھا کہ منسٹر نے شاید اُسے کہا ہے کہ جتنی بار تو پُل کا نام سُن کر نعرے لگائے گا اتنے ہی گُل تیرے اوپر پھینکونگا۔ایک مرتبہ جب وہ پُل کے بدلے بُل کے لفظ پر اُچھل پڑا تو میں نے اُسے پوچھا کہ او منسٹر کے بُل اس وقت تو منسٹر کی زبان سے پُل کا نہیں بُل کا لفظ نکلا تو تو کس خوشی میں اُچھل پڑا۔ویسے مجھے ایک بات بتا کہ جب ہم میں سے کوئی پڑھا لکھا آدمی بھی منسٹر کی انگریزی تقریر صحیح طرح سے نہیں سمجھ پا رہا ہے تو گنوار ہونے کے باوجود کس بناء پر زندہ باد زندہ باد چلا رہا ہے مجھے تو اس پُل کی مضبوطی پر بھی شک ہو رہا ہے۔یہ سُن کر وہ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ گھورتے ہوئے بھیڑ کی دوسری جانب چلا گیا۔

بہر حال منسٹر صاحب جب پُل پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے تو افسروں اور ورکروں کی ایک بڑی جماعت ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پُل کی دوسری جانب نعرے لگاتے ہوئے پہنچ گئی۔اب منسٹر کو واپس لانے کے لئے ان کی سرکاری گاڑی پُل سے گزرنے لگی۔گاڑی جونہی پُل کے بیچوں بیچ پہنچ گئی تو یہ مضبوط پُل گاڑی کو عزت کے ساتھ اپنی گود میں بٹھا کر ندی کی گہرائی میں نہانے کے لئے ڈوب گیا۔ ٹھیکیدار یہ بھونچال زدہ منظر دیکھ کر سر پٹ گھوڑے کی طرح بھاگنے لگا اور لوگ پتھر پھینکتے ہوئے اُس کے پیچھے دوڑ پڑے۔منسٹر کا وہ زندہ باد کرنے والا چمچا جب پولیس گاڑی کے نیچے چھپ گیا تو میں اُسے لاتیں مار مار کر پوچھنے لگا کہ منسٹر کے بُل تو کیوں ہر پُل پر نعرے لگا رہا تھا۔منسٹر کو اگلے الیکشن تک ندی کے اُس پار بیٹھنا پڑھتا اگر رات کے اندھیرے میں اُس کے وظیفہ خوار چمچوں نے اُسے بھینس پر بٹھا کر واپس نہ لایا ہوتا۔

دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے میں کئی بار انگریزی کے جن سے زور آزمائی کرتا رہا لیکن ہر بار ناکامی کو اپنا نصیب سمجھ بیٹھا۔خیر اس زبان سے اسوقت میرا بھرپور آمنا سامنا ہوا جب میٹرک کا انگریزی پرچہ امتحان حال میں ایک اجنبی شئے کی طرح بورڈ والوں نے میرے سامنے پھینک دیا۔میں نے جب کئی مرتبہ اس پرچے پر اوپر سے نیچے تک نظروں کے تیر چلائے تو کہیں پر بھی مجھے اپنے جانے پہچانے لفظ جیسے ایپل، بال، اور ہو نظر نہیں آئے۔میں جب اپنے گمشدہ لفظوں کا غم اپنے دوسرے ساتھی سے بانٹنے لگا تو وہ بول پڑا کہ اسوقت تم جوابی کاغذ پر وہی صاف صاف لکھو جو سوالی پرچے پر لکھا ہوا ہے۔میں نے بغیر الجھے اُس کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے وہی الفاظ من وعن صاف صاف جوابی کاغذ پر لکھ ڈالے اور قسمت نے اتنا زور لگایا کہ رزلٹ میں دوسرے پرچوں کے ساتھ ساتھ انگریزی کا پرچہ بھی امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس ہوا تھا۔میں نے جب یہ خوشخبری دادا جان کو سنائی تو وہ خوش ہو کر بولے کہ اب تمہیں مزید پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے اب تم چٹھی بھی پڑھ سکتے ہو اور زمین کے کاغذات بھی دیکھ سکتے ہو۔باقی رہا سوال تیری نوکری کا تو وہ تو میں منسٹر سے تجھے ضرور دلوادونگا۔یہ سُن کر میں خوشی سے جھوم اٹھا کہ چلو اب تو انگریزوں کے اس انگریزی کے بھوت سے آزاد تو ہو گیا۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی۔، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔**بغیر بینک تفصیلات کے حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔**

اردو کی شعری روایت میں نسائی شاعری کی آواز عہد حاضر میں ایک معتبر مقام رکھتی ہے۔ مردوں کے پہلو بہ پہلو مستورات نے بھی عرصۂ شاعری پر اپنے قدم جمائے ہیں اور کئی اہم اور معتبر شاعرات نے اپنے وجود کا احساس دلایا ہے۔ بطور خاص تقسیم ہند کے بعد شاعرات کی علمی وادبی کاوشوں کو نہ صرف یہ کہ سراہا گیا بلکہ انہیں انتقادات میں بھی مناسب مقام عطا کیا گیا۔ مگر یہ صورت حال روزِ اول سے نہیں تھی حالانکہ اردو میں نسائی شاعری کی روایت کا سلسلہ تین سو سال پرانا ہے۔ بطور خاص اٹھارویں صدی کہ جسے اردو شاعری کا عہد زریں کہا جاتا ہے، میں بھی کئی نسائی آوازیں اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھیں حالانکہ معاشرہ کی فرسودہ روایات، پردے کے اہتمام اور چہار دیواری میں مقید رہنے کی وجہ سے یہ آوازیں وہ مقام حاصل نہ کر سکیں جن کی وہ حقدار تھیں۔ بعض قدیم تذکروں میں شاعرات کا ذکر بھی موجود ہے مگر سرسری طور پر۔ ان میں سے بیشتر خواتین فرضی ناموں سے اپنا کلام پیش کرتی تھیں اور یہ سلسلہ تادیر قائم رہا۔ نقادوں نے بھی نسائی شاعری کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور ان پر نقالی وتقلید کا الزام بھی عائد کیا مگر ان سب مخالفتوں کے باوجود نسائی آواز کو دبایا نہ جا سکا۔

آزادی کے بعد کی نسائی شاعری اپنی فکری بلاغت، منفرد آواز، نسائی لب ولہجہ، تانیثی بغاوت اور سرکشی وبیباکی کے لئے مشہور ہے۔ ہندوستان کی ایسی آوازوں میں شفیق فاطمہ، ممتاز مرزا، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، مسعودہ حیات، نور جہاں ثروت، بلقیس، شہناز نبی، عذرا پروین، شبنم اور علینا عشرت بطور خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کے علیٰ الرغم پاکستانی شاعرات کا سلسلہ میں دراز ہے۔

ہمارے پیش نظر کتاب بعنوان 'ہندوستانی شاعرات' مرتبہ ڈاکٹر نجمہ رحمانی ایسی شاعرات کا مجموعۂ انتخاب ہے جس میں عہد اول سے تا دم تالیف کتاب ہندوستانی شاعرات کا کلام شامل کیا گیا ہے لیکن اس تحقیقی تالیف میں عہد حاضر کی بہت سی اہم شاعرات کے نام ضرور رہ گئے ہیں جن کا تذکرہ اس کتاب میں ضرور ہونا چاہئے اور اس کے بغیر اس کتاب پر ایک سوالیہ نشان ضرور پیدا ہوتا ہے۔

انہوں نے کل ۲۸ شاعرات کی فہرست

مرتبہ : ڈاکٹر نجمہ رحمانی
مبصر : ڈاکٹر مظہر احمد
قیمت : 300 روپئے
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
ملنے کا پتہ : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مرتب کی ہے جن میں سیدہ فرحت سے لے کر فوزیہ فاروقی کے کلام کا ایک معتبر اور معیاری انتخاب شامل کتاب کیا ہے۔ ابتداء میں ڈاکٹر نجمہ رحمانی کا ایک مختصر مقدمہ بھی شامل ہے جو تقریباً ساڑھے پانچ ہزار لفظوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی مناسبت سے یہ مقدمہ محض واجب کفائی کی حد تک ہی ہے۔ حالانکہ مقدمہ مزید طویل ہونا چاہئے تھا اس لئے کہ اس کتاب میں جن شاعرات کا تذکرہ شامل کیا گیا ہے، ان کی شاعری سے متعلق اپنی تالیفی نوعیت پر بھی گفتگو ہوتی تو مزید خنکی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس میں اردو کی نسائی شاعری کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے زیر انتخاب شاعرات کے فکر وفن کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ انتخاب کے طریقۂ کار اور دشواریوں کے سلسلہ میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''آزادی کے بعد اسے اب تک شاعرات کی ایک طویل فہرست ہے جس کے تمام ناموں کو اس انتخاب میں شامل کیا جانا ممکن نہ تھا۔ اس میں کچھ کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بھی درپیش تھا جس کی وجہ سے کئی نام چھوٹ گئے۔ انتخاب میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ کم از کم پانچ چھ غزلیں یا نظمیں شامل کی جائیں تاکہ شاعرہ کے مخصوص اسلوب کی شناخت ہو سکے۔''

شاعری کا انتخاب بظاہر آسان بباطن انتہائی دشوار گزار مرحلہ ہے۔ ذاتی پسند وناپسند بھی اسی میں در آتی ہے۔ بقول غالبؔ 'شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے' مگر نجمہ رحمانی نے نہایت غیر جانبداری اور ذاتی پسندیدگی سے صرف نظر کر کے عمدہ انتخاب پیش کیا ہے۔ بحر ذخار سے موتی چن لانا کارِ اہم ہے اور اس کی دشواریوں سے اہل نظر واقف نہیں۔ انتخاب کو کئے کی کان سے ہیرے کی تلاش کا عمل ہے چنانچہ بزبان نجمہ رحمانی یہ دعویٰ کر سکتی ہیں کہ

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

دیدہ زیب سرورق اور مضبوط جلد سازی نے اس کتاب کے ظاہری حسن میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ نسائی شاعری سے دلچسپی رکھنے والے احباب کے لئے یہ کتاب مشعل راہ ثابت ہوگی۔

❑❑❑

اردو کی شعری روایت میں غزل کا مقام اور دوسری اصناف کے مقابلے میں اعلیٰ وارفع ہے۔غزل نے اپنی ابتدائی دور سے انٹرنیٹ کے موجودہ زمانے تک توانائی و تابناکی کے ساتھ دلوں کو مسحور کرنے اور ضمیروں کو جھنجھوڑنے کا کام کیا ہے۔ اس درمیان غزل پر مختلف الزامات عائد کر کے اسے تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ایک الزام یہ بھی تھا کہ غزل مرد شعرا کے ہاتھوں کٹھ پتلی کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں، اس صنفِ سخن کا استعمال کرتے ہیں ۔ اردو شاعرات کا غزل کے میدان میں قدم رکھنا اور دن بدن ان کی تعداد میں اضافے کا ہونا دوسرے تمام الزاموں کی طرح اس الزام کو بھی رد کرتا ہے۔غزل کی سخت جانی نے مشکل دور کا سامنا صبر آزما حوصلوں کے ساتھ کیا بلکہ اس کی مقبولیت نے نکتہ چینوں کو دانتوں تلے انگلی دبانے پر مجبور کر دیا۔اردو غزل کی پہلی شاعرہ کون تھی، اس سلسلے میں تاریخ خاموش ہے لیکن بعض علمائے ادب کے نزدیک دکن کی چندا ساکن اردو غزل کی پہلی شاعرہ ہیں۔انہوں نے اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا اور خدائے سخن میر تقی میر کی دختر نیک جن کا نام بیگم تھا، کی طرف بھی کچھ اشعار منسوب کیے ہیں ۔ اردو شاعرات کا ذکر مصحفی اور شیخ کریم الدین نے بھی اپنے تذکروں میں کیا ہے۔ اس کے بعد غزل کی زنجیر میں شاعرات کڑیوں کی طرح منسلک ہوتی چلی گئیں۔جس کا سلسلہ دراز ہوتے ہوئے دورِ حاضر تک آتا ہے اور اس میں ایک نام فوزیہ رباب کا بھی ہے۔

فوزیہ رباب احمد آباد، گجرات کی رہنے والی ہیں لیکن شادی کے بعد انہوں نے گوا کو اپنا وطن ثانی بنا لیا ہے۔غزل کے میدان میں انہوں نے نہ صرف شوق و شغف کا ثبوت دیا بلکہ اپنی آواز کو نمایاں کرنے میں کامیاب بھی ہوئیں۔ان کی غزلوں میں ایسا مثلث بنتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جس میں خود سپردگی کا والہانہ رنگ، ہجر کی کیفیات اور زندگی کے دوسرے تجربات بھی شامل ہیں ۔ان کے دل میں محبوب کی تصویر سجی ہوئی ہے، جس کی چاہت سے ان کی جبیں منور ہے۔محبوب کی یادیں ان کی روح میں اس طرح سرایت کر گئی ہیں کہ وہ اپنی زندگی کا قیمتی حصہ نچھاور کر کے بقیہ عمر اس پر ہی لٹانے کی تمنا رکھتی ہیں۔کچھ اشعار دیکھیں:

میری روح میں تیری یاد اترتی ہے
ہولے ہولے مدھم مدھم شہزادے
جتنی عمر ہے باقی وہ بھی تیرے نام
جتنی تھی وہ تجھ پہ لٹا دی شہزادے

محبوب کی چاہت اور شوخی و شرارت کا یہ انداز بہت دور تک ان کا ساتھ نہیں دیتا۔جلد ہی ان کے لہجے میں سوز و گداز کی مدھم آنچ سلگنے لگتی ہے۔ہجر کی بے کرانی میں وصل کا تصور ایک نئی کیفیت کو جنم دیتا ہے۔ہمارے محسوسات عشق کی دنیا میں ایک نئے منظر سے لطف اٹھانے لگتے ہیں۔انہوں نے ہجر کی کیفیات و واردات کا بیان اپنی غزلوں میں کیا ہے، وہ قاری کے تجسس کو ضرور بڑھاتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

میں بھی خود سے روٹھی روٹھی رہتی ہوں
جب سے تو نے مکھ کو موڑا

کوزہ گر کس کو سنائے خاموشی کے بین رباب
دل روتا ہے درد چھپا کر شہزادے

مصنف : فوزیہ رباب
مبصر : ڈاکٹر عادل حیات
قیمت : 500روپئے
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
ملنے کا پتہ : مکتب جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

گئے زمانوں سے رشتہ میرا نہیں ٹوٹا
ادھورے خوابوں کی رکھی ہے باس شہزادے

بس اک خواب کی میت ہے اور ماتم داری ہے
ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے آنکھوں کے اس پار میں

غزل کے فنی تقاضوں کے مطابق انہوں نے اپنے تجربوں کا اظہار علامتی پیرائے میں کیا لیکن جدید شعرا کی طرح ان کے اشعار پر علامتوں کی دبیز پرتیں نہیں ہیں۔اس لیے ان کے اشعار میں اثر انگیزی کی کیفیت دوبالا ہو گئی ہے۔چند اشعار پیشِ ہیں:

اس پار تھا غریب کا لاشہ پڑا ہوا
بجنے لگی تھیں جھیل کے اس پار تالیاں

ہوائے شہر سے جس کو بھی خوف آتا ہے
وہ کیسے گاؤں کا کچا مکان چھوڑے گا

فوزیہ رباب کی غزلوں میں جا بجا مکالماتی انداز بھی پایا جاتا ہے۔اس طرح کے اشعار کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دو کردار آپس میں محوِ گفتگو ہیں۔ظاہر سی بات ہے کہ ایسے اشعار قاری کے ذہن پر ڈرامائی کیفیات اجاگر کرتے ہیں لیکن اس ڈرامے کے کرداروں کے چہرے پر کسی بھی طرح کا نقاب پڑا نہیں ہوتا۔

فوزیہ کی اکثر غزلوں میں ان کا نسوانی رنگ چھلک گیا ہے۔یہ وہی رنگ ہے جسے مردانہ سماج نے چہار دیواری میں قید رکھا اور ایک زمانے تک گھر کی زیب و زینت کا کام لیا لیکن جیسے ہی مرد سماج کی گرفت میں گنجائش پیدا ہوئی ان رنگوں نے بھی اپنا جلوہ دکھانا شروع کیا۔پروین شاکر، کشور ناہید اور دوسری شاعرات نے اپنی آواز نہ صرف غزل اور دوسری اصنافِ نثر و نظم میں بلند کی بلکہ مردانہ سماج پر ضربیں بھی لگائیں۔دوسری شاعرات کی طرح فوزیہ کی غزلوں میں بھی ان کی نسوانیت کا کھل کر اظہار ہوا ہے۔ان کے اس رنگ میں روزمرہ کے تجربہ و احساس اور زندگی کے نشیب و فراز کا اظہار تذکیر و تانیث کے خطِ فاصل کے ساتھ ہوا ہے۔

ان کی ایک غزل سے تین اشعار پیش ہیں، جس میں ایک عورت اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے:

عشق بھی کرنا ہے گھر کے کام بھی
یہ مصیبت بھی نئی ہے ان دنوں
اک سہیلی سے لڑائی ہوگئی
تم کو ہی بس پوچھتی ہے ان دنوں
تیرے آنے کی خبر کا ہے کمال
آئینے سے بن رہی ہے ان دنوں

فوزیہ رباب کا اسلوب کلاسیکی بھی ہے اور جدید بھی۔ چند مخصوص الفاظ جیسے کہ شہزادہ، سانولا، پاگل، گوزہ گر، پیا، سنگھار اور مکھ وغیرہ ان کے اسلوب کی انفرادیت کا اشاریہ ہیں ۔غزل سے ان کی والہانہ محبت اور آنکھوں کے اس پار کی غزلوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ اسی تندخوئی اور ذوق و شوق کے ساتھ غزل کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہیں تو ایک دن ادب کے آسمان پر درخشندہ ستاروں میں سے ایک کا نام فوزیہ رباب بھی ہوگا۔

□□□

'نیادور' ہندوستان کے بیشتر اہم شہروں کی ایجنسیوں پر دستیاب ہے۔ ایجنسیوں کی فہرست شائع کی جارہی ہے۔

'نیادور' ماڈرن بک ڈپو، جن پتھ، حضرت گنج، لکھنؤ میں بھی دستیاب ہے۔

۱	محمد نعیم دانش محل، سنٹرل ہوٹل، مقابل زیرزمین پارکنگ، امین آباد، لکھنؤ Mo. 9792361533
۲	مولانا محمد وکیل ندوی علامہ شبلی لائبریری، دارالعلوم ندوۃ العلماء ٹیگور مارگ، ڈالی گنج، لکھنؤ-226007
۳	سید محمد سرور عرش ایسوسی ایٹس، خواجہ ٹاور، نزد وی مارٹ، وکٹوریہ اسٹریٹ، نخاس، لکھنؤ
۴	نظامی پریس نزد شیعہ کالج، وکٹوریہ اسٹریٹ نخاس، لکھنؤ
۵	مولانا اسیف جائسی نورِ ہدایت فاؤنڈیشن، امامباڑہ، غفرآنماب چوک، لکھنؤ 8736009814
۶	ادارۂ منظیم المکاتب ریڈ گیٹ بلڈنگ، جگت نارائن روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ

ہندوستان کے دیگر شہروں کی ایجنسیاں

۱	جناب اسد یار خان ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202002 موبائل۔ 96341 05087
۲	جناب طالب حسین الیف۔ڈی۔انٹر کالج، کاٹھ دروازہ، مرادآباد۔ 244001، یوپی۔ موبائل۔ 098372 25809
۳	ڈاکٹر نہال رضا یوتھ فیڈریشن، عسکری کلینک، محلہ قاضیانہ، پوسٹ ردولی ضلع۔فیض آباد۔ 224120 موبائل۔ 94151 52710
۴	جناب علی حسین ادریسی ادریسیہ بک سینٹر، نیوز پیپر ایجنٹ، سنگت کلا، غازی پور۔سٹی۔ 233001 یوپی موبائل۔ 93693 05266 .
۵	جناب محمد بدرالدین ناولٹی بکس، علامہ اقبال چوک قعلہ گھاٹ، دربھنگہ۔ بہار . 846004
۶	جناب زکریہ ایاز ۱، پریم نگر، اورئی، جالون موبائل۔ 9452452788
۷	جناب امتیاز انور بک امپوریم، اردو سبزی باغ پٹنہ۔800004 موبائل۔ 93048 88739
۸	جناب ضمیر احمد ضمیر بک ڈپو، قطب شیر، سہارنپور۔ یوپی . 098971 08075
۹	جناب روشن صدیقی ناصر لائبریری، ابوبازار اونچوا۔ گورکھپور۔(U.P.) 273001 9451846364
۱۰	ڈاکٹر شکیل احمد قاسم منزل، ڈومن پورا، چنگی مؤناتھ بھنجن۔ 275101 - Mo. 92367 22570
۱۱	جناب الیس۔ایم۔عباس ایڈوکیٹ ۸۸، تارتلہ، جونپور۔ 222001- Mo. 98380 81405
۱۲	جناب بھوانی پرساد گپتا، 'ویدھ' سابق نامہ نگار، 'ترون بھارت' اترولہ، بلرامپور (U.P.) 271604
۱۳	میسرس کمالیہ بک ڈپو تاتارپور، بھاگلپور۔ بہار، 812002 Mo. 93341 90757
۱۴	جناب کامل مجید محلہ چاہ میر، مقابل نواب دولہے کی کوٹھی، بدایوں Mo. 94102 93406
۱۵	جناب ساغر وارثی ایمن زئی، جلالپور، شاہجہانپور Mo. 93691 90785
۱۶	میسرس انیس بک ڈپو ۷/۱، محلہ۔آٹالہ، الہ آباد۔ Mo. 93351 68463
۱۷	جناب عباد احمد ایڈوکیٹ جج صاحب کا پھاٹک، مولوی ٹولہ فانی روڈ، بدایوں۔243601 Mo. 94124 08110
۱۸	عارف علی بک سیلر لطیف مارکٹ، خیرآباد ضلع سیتاپور۔261131(U.P) Mo. 93363 04064
۱۹	جناب ایس۔عزاز دار حسین نقوی ۲۵/۶۰، حضرت گنج،، وریاباد الہ آباد(U.P) 211003 Mo. 99198 16295
۲۰	میسرس پوجا پستک بھنڈار سرائے میر، اعظم گڑھ۔276305 Mo. 94510 39177
۲۱	میسرس ہمدم بک اسٹال، مبارک پور اعظم گڑھ، 92362 72662
۲۲	جناب محمد سلیم (جنرلسٹ) پیر بٹاون (پھلواری)، بارہ بنکی Mo. 94157 74724
۲۳	میسرس نظامی بک ایجنسی (نظامی پریس) محلہ۔سوتھا، شکیل بدایونی روڈ، بدایوں Mo. 93583 57370

۲۴	میسرس عامر کتاب سینٹر ۳۳۴۔ ایچ، گلی نمبر۔ ۶، باٹلہ ہاؤس جامعیہ نگر نئی دہلی۔ 110025 Mo. 098110 29831
۲۵	میسرس قریشی نیوز ایجنسی جی۔ بی۔ ایچ۔ مین روڈ، راؤ کیلا، اڑیسہ -760001 Mo. 94394 99458
۲۶	میسرس صالحہ بک ٹریڈیرس اینڈ اسٹیشنر جامع مسجد، مومن پورا ناگ پور، مہاراشٹر۔-, 440018 Mo. 07122 721069
۲۷	میسرس راعین بک ڈپو ۴۳۷، کٹرہ، الہ آباد، (U.P). 211003 Mo. 99365 16895
۲۸	جناب بصرالدین سکریٹری غالب لائبریری، ۶، غالب نگر فیروز آباد، -(U.P).283203 Mo.94562 39242
۲۹	ڈاکٹر وجہہ القمر صدیقی بے۔ کے کالونی، لولی پور، حنیف نگر لولی پور سلطانپور (U.P). 228001 Mo.94515 58318
۳۰	جناب تنویر تنویر بک ڈپو، ۱۱۲، جی۔ ٹی۔ روڈ آسن سول، مغربی بنگال- .713301 Mo. 98321 14440
۳۱	میسرس کتاب دار پبلکیشنس ۱۱۰۔ ۱۰۸، جلال منزل ٹمکر اسٹریٹ، ممبئی، 7400008
۳۲	خالد لائبریری نزد مسلم فنڈ ٹرسٹ، دیوبند، سہارنپور Mo.92863 64999
۳۳	میسرس ایم۔ ایچ بک سیلر ہول سیلر اینڈ ریٹیلر، محلہ رحم گنج دربھنگہ۔.846004 Mo. 094314 58429
۳۴	جناب ندیم اختر جن سیوا کیندر، پوسٹ۔ گنج ڈنڈوارہ ضلع۔ کاس گنج، (U.P) 207242
۳۵	میسرس خوشتر کتاب گھر پوسٹ، ہلور، سدھارتھ نگر- 272191 Mo. 94156 69624
۳۶	نور نبی بک سیلر اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ سی۔ کے۔ ۱۰۱ / ۴۲، دال منڈی وارانسی۔ (U.P) 221001 Mo-94153 55954
۳۷	جناب شہاب حسین 'جرنلسٹ' محلہ ناظر پورہ، بہرائچ۔ 271801 Mo- 94523 11999
۳۸	جناب محمد شوکت علی بک اسٹال ۲۱ / اے، ایچ۔ ایم۔ ایم اسکوائر نزد مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا۔ مغربی بنگال
۳۹	جناب خالد قیصر محلہ سریان،، پوسٹ محمدی۔ ضلع لکھیم پور (U.P).262804 Mobile .94155 62853
۴۰	میسرس جبلی بک سینٹر ۱۱۹ / ۱۰۵، جبلی کالج روڈ چمن گنج، کانپور (U.P).208001 Mo. 09336720718
۴۱	میسرس سحر بک ایجنسی وثیقہ عربک کالج، راٹھ حویلی، ضلع فیض آباد۔ 224001.(U.P), Mo.95653 83714
۴۲	جناب خبیب حسن کمرہ نمبر ۲۲۳، جامعیہ سلفیہ، ریوری تالاب بی۔ ا / ۱۸، جی، وارانسی۔ 221010 Mo . 95576 3570014
۴۳	جناب ایس۔ پرویز میسرس ہورائزن ڈسٹری بیوٹر ۱۴۔ بی۔ گوراچاند روڈ، کولکاتا۔700014 Mo. 9831311918
۴۴	جناب محفوظ الرحمن کنسٹرکشن ڈویژن۔ ا، پی۔ ڈبلیو۔ ڈی، ہردوئی Mo . 9451916715
۴۵	جناب اظہار ندیم عرشیہ پبلکیشن، اے۔ ۱۷۰ گراؤنڈ فلور، ۳۔ سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، نئی دہلی۔ Mo 9971775969
۴۶	میسرس۔ سکندر نیوز ڈسٹری بیوٹر اینڈ سپلائر، لال چوک، شری نگر، جے اینڈ کے Mo. 9797797124
۴۷	میسرس کوثر ایجنسی ریاض خان، معرفت اکولہ پان بھنڈار پان مارکٹ، جنتا بازار، اکولہ۔ 444001 Mo. 098221 25888
۴۸	ماسٹر محمد سلیم شجاع ول پور، پوسٹ ڈنڈوارہ۔ ضلع کاس گنج Mo. 9557996293
۴۹	جناب سالم رضوی معرفت عثمانیہ بک ڈپو ۱۲۵، ربیندر اسرائے، کولکاتا Mo. 09433050634
۵۰	جناب محبوب علی محلہ۔ چکی ٹولہ، پوسٹ لہرپور، سیتاپور Mo. 9559347469
۵۱	جناب حاجی نثار احمد شعبہ اردو، حیدر آباد یونیورسٹی، سینٹرل یونیورسٹی، پروفیسر سی آر راؤ روڈ حیدر آباد۔500046 Mo. 09391062713
۵۲	جناب اشرف الحق انصاری اشرف نیوز ایجنسی، وارث پورا، کامپٹی، ناگپور Mo. 08956697056
۵۵	مکتبۂ جامعہ اردو بازار، جامع مسجد، نئی دہلی۔ ۶
۵۶	جناب شفیق الرحمن 170 / 1، گنگا وہار، KDA کالونی، جاج مئو، کانپور موبائل: 9415483499
۵۷	ابرار الحق شاطر گورکھپوری الٰہی باغ نزد چھوٹی مسجد، گورکھپور موبائل: 9695122448

نیادور کی ایجنسی صرف دس شماروں کی ایڈوانس رقم ڈرافٹ کے ذریعہ بھیج کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایجنسیاں ۴۰ رفیصد کمیشن کی حقدار ہوں گی۔

آپ کے خطوط

چند ماہ قبل نامور ادیب غضنفر کے پاس بیک وقت ''نیا دور'' کے تازہ تین چار شمارے نظر نواز ہوئے تھے۔ ویسے رسالوں سے انسیت رکھنے والے واقف تھے کہ یہ ماہنامہ ہے۔ میں بھی واقف تھا، برسوں لکھنؤ میں جو رہا تو واقف رہوں بھی نا اس سے کیسے، اور اس کی دستاویزی حیثیت تو مسلم تھی ہی، لیکن اشاعت کی سست رفتاری اتنی کہ اسے سالنامہ کہنے سے پہلے سوچنے کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دو ماہ قبل عصمت چغتائی پر اس میں شائع ہونے والا اپنا مضمون پڑھ رہا تھا تو تیزی سے ایک صاحب میرے ہاتھوں سے رسالہ لیتے ہوئے یوں گویا ہوئے ''اچھا، نیا دور کب سے ماہنامہ ہو گیا ہے''۔ چنانچہ مجھے بھی کہنا پڑتا ہے کہ سچ 'نیا دور' ایک نئے دور سے گزر رہا ہے۔ اس نئے دور کی پہلی خصوصی اشاعت میں 'تسلسل' ہے۔ دوسری، مشمولات کی دلکشی یعنی ہر سطح کے لکھنے والوں کو اس میں شمولیت۔ 'نیا دور' کی دستاویزی حیثیت اور نمبرات کا ہر ایک معترف تھا، لیکن مواد کے انتخاب میں دیگر سرکاری رسالوں کی طرح 'معیارِ طولانی' یا 'آسمانی تعلق داری' کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وقت پر رسالہ کی اشاعت نہیں ہو پاتی تھی، اس لیے سال بھر میں کم ہی لوگ رسالہ میں جگہ پاتے تھے اور ایسے میں 'معتبر لوگوں' کا خیال رکھنا ضروری ہوتا تھا، لیکن نئے دور کے نئے شماروں کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ 'معیارِ طولانی' کی طوالت تھوڑی کم کر لی گئی اور مختلف طبقوں کی شمولیت ہونے لگی، جس سے رسالہ کے حسن میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کا دائرہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ میں پر امید ہوں ہے کہ موجودہ مدیر اس رسالہ کو نہ صرف خصوصی نمبرات کی حیثیت سے متعارف کرواتے رہیں گے، بلکہ اس میں ہر سطح کے قلمکاروں کی شمولیت بھی یقینی بنائیں گے، جس سے نئے دور کے 'نیا دور' کا مختلف حوالوں سے حوالہ دیا جا سکے۔

سلمان عبدالصمد، جے این یو نئی (دہلی)

میں ماہنام نیا دور کا مستقل قاری رہی ہوں۔ لیکن گزشتہ چند برسوں سے یہ رشتہ ذرا کمزور پڑ گیا تھا۔ لیکن محترم سہیل وحید صاحب کی کوششوں نے نیا دور کے قارئین کو دوبارہ یک جا کر دیا ہے۔ رسالے میں غیر معمولی تبدیلی دیکھ کر بھلا کیسے داد نہ دوں!! میں کہہ سکتی ہوں کہ رسالہ 'نیا دور' محترم مدیر کی کاوشوں سے اسم با مسمیٰ ہو گیا ہے۔ صحیح معنوں میں اس کا نیا دور شروع ہو گیا ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اس پر کاروادی میں موصوف کو بہت سی دشواریاں بھی جھیلنا پڑی ہوں گی۔ میں تہہ دل سے رسالے کے جملہ اراکین بطور خاص عالی جناب سہیل وحید صاحب کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ ماہ دسمبر کا اداریہ بیحد سنجیدہ موضوع پر لکھا گیا ہے۔ میں ذاتی طور پر آپ کی موقف سے اتفاق رکھتی ہوں۔ خوش آئند بات ہے کہ اداریہ کی مناسبت سے شمارے میں اردو زبان، رسم الخط اور اس کی تدریس کے حوالے سے کئی ماہرین کے مضامین بھی شائع کیے گئے ہیں۔ ایک اچھی بات یہ نظر آئی کہ آپ نے گل افشانی کا ایک نیا کالم شروع کیا، جس کا آپ نے اپنے اداریہ میں بھی ذکر کیا ہے۔ اس کالم کے تحت آپ نے ''اللہ کے نام پہ پڑھ لے بابا'' کے نام سے ایک ایسی دلچسپ طنزیہ و مضاحیہ مضمون شائع کیا ہے، جو ہمیں غور و فکر اور خود احتسابی کے لیے مجبور کرتا ہے۔ محبوب حسن صاحب کی یہ تحریر قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی بھرپور قوت رکھتی ہے۔ کہیں کہیں طنز کا پہلو زیادہ شدید ہو گیا ہے، جو نشتر بن کر ہمارے دل و دماغ میں اتر جاتا ہے۔ اس میں انہوں نے زوال پذیر اخلاقی، تہذیبی اور ادبی قدروں کا ایک ایسا رنگا رنگ نگار خانہ پیش کیا ہے، جو ہمیں مسرت سے بصیرت کا سفر طے کراتا ہے۔ اس مضمون سے یقینی طور پر شمارے کی ہر دل عزیزی میں اضافہ ہوا ہے۔ عادل فراز اور مینا عرفان کے افسانے پسند آئے۔ آپ نے نعت کی بھی خوبصورت محفل سجائی ہے۔ محترم قاضی عبدالستار صاحب نے جیسے ماضی کو لفظوں میں قید کر لیا ہو۔ انور ادیب اور غضنفر کے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔

ڈاکٹر شاہینہ صدیقی (بریلی)

ماہنامہ ''نیا دور'' دسمبر کا شمارہ بطور اعزازیہ موصول ہوا۔ تازہ شمارے میں میری طنزیہ و مزاحیہ تحریر ''اللہ کے نام پہ پڑھ لے بابا'' کی اشاعت نے مجھے طمانیت کے انوکھے احساس سے دوچار کیا۔ خاکسار آپ کا صمیم قلب سے شکر گزار ہے۔ اداریہ کے ذیل میں محترم سہیل وحید صاحب نے اردو زبان کے عصری تقاضوں کی جانب اشارہ کیا ہے۔ آپ کے سوالات یقینی طور پر قابل غور ہیں۔ امید ہے کہ ان باتوں پر ماہرین لسانیات توجہ فرمائیں گے۔ آپ کے یہ خیالات ہمیں فطری طور پر دعوت فکر دیتے ہیں:

''یہ ایک فطری عمل ہے کہ زبان آسانیاں تلاش کرتی ہے۔ زبان ایک فطر بہاؤ کا نام ہے۔ اس پر کسی کا زور نہیں چلتا لیکن اردو میں یہ زور چلتا ہوا نظر آتا ہے کہ سیکڑوں برس پرانا املاء اور حروف تہجی کو من عن باقی رکھا گیا ہے اور اپنی اسی جہد مسلسل کو اردو داں طبقہ اپنی بہت بڑی کامیابی اور Achievement گردانتا ہے۔''

دوسری اہم بات یہ کہ اس شمارے میں اردو زبان، رسم الخط اور اس کی تدریس کے حوالے سے کئی اہم اور کارآمد مضامین بھی شامل ہیں۔ غضنفر، شافع قدوائی اور انور ادیب نے اپنے مضامین میں اردو زبان کے سنجیدہ مسائل کو معروضی انداز میں موضوع بحث بنایا ہے۔ بزرگ ادیب و فکشن نگار قاضی عبدالستار کا مضمون ''عصمت آپا اور ان کے طفیل میں'' یادوں کے دریچوں سے ماضی کے گزرے ہوئے لمحات سے مکالمہ کرتا ہے۔ ان کے مخصوص انداز بیان کے باعث تحریر کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ عصر حاضر کے معروف قلم کار مشرف عالم ذوقی نے سال رواں کی تمام تر ادبی و تخلیقی سرگرمیوں کا خوبصورت جائزہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے اپنی گفتگو کا اختتام اس نوید کے ساتھ کیا ہے کہ ''ہم اجڑیں گے/ پھر بسیں گے/ ادب ناخوشگوار حالات میں ہی/ زندگی کے بادبان کھولتا ہے۔'' افسانے کا باب بھی دلچسپ ہے۔ خصوصاً مینا عرفان صاحبہ کے افسانہ ''امید'' میں انسانی زندگی کے نازک و لطیف ترین جذبات و احساسات کی پر اثر تصویریں رقصاں ہیں۔ افسانے کا موضوع اور اس کا انداز پیش کش قابل داد ہے۔ بازیافت کا گوشہ بھی اچھی پیش رفت ہے۔ ''نیا دور'' کی حیات نو کے لیے میں ایک بار پھر رسالے کے جملہ اراکین کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ تیرے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے!!

ڈاکٹر محبوب حسن (بنارس)

صدر جمہوریۂ ہند جناب رام ناتھ کووند نے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں منعقد پروگرام کا آغاز شمع روشن کر کے کیا۔
اس موقع پر اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی بھی موجود رہے (۱۶؍دسمبر ۲۰۱۷ء)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک سے ملاقات کے دوران
اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی نے ان کی کتاب 'چرویتی!! چرویتی!!' کو اعزاز سے نوازے جانے پر مبارکباد پیش کی (۱۳؍دسمبر ۲۰۱۷ء)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک 'کمبھ لوگو لانچ' کے پروگرام کے موقع پر محکمۂ سیاحت کے
'ون اسٹاپ ٹریول سالیوشن پورٹل' کا افتتاح کرتے ہوئے۔ ساتھ میں ہیں اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی (۱۲؍دسمبر ۲۰۱۷ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

صدر جمہوریۂ ہند جناب رام ناتھ کووند کا اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک
اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی اموسی ائیر پورٹ لکھنؤ پر استقبال کرتے ہوئے (۱۵؍دسمبر ۲۰۱۷ء)

نائب صدر جمہوریۂ ہند جناب وینکیا نائیڈو کا اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک
اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی اموسی ائیر پورٹ لکھنؤ پر استقبال کرتے ہوئے (۳؍دسمبر ۲۰۱۷ء)

वर्ष : 72 अंक 10
जनवरी 2018
मूल्य : 10 रु./–
वार्षिक मूल्य : 110 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, अनुज कुमार झा, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, सुहेल वहीद